



سرزمین پروٹوہمار

مصنف

جناب پروفیسر کرم حیدری صاحب (مرحوم)



تاریخ کے آئینے میں

جملہ حقوق محفوظ بحق خالد محمود حیدری

۱۹۸۰ء _____ طبع _____ دوم

تعداد _____ ایک ہزار

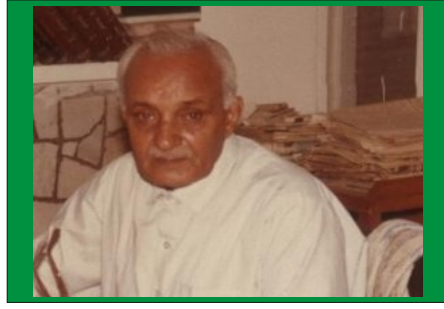
خالد محمود حیدری ----- زیر اہتمام مکتبہ الحمود

سٹرائٹ ٹاؤن راولپنڈی

طابع پرنٹنگ پریس

ترتیب

۶	دیباچہ طبع دوم
۷	پیش لفظ
۱۱	پوٹھوہار کی حدود
۲۰	زمانہ ماقبل تاریخ
۲۶	آریاؤں کی آمد
۳۹	ایرانی اور یونانی اثرات کا زمانہ
۴۷	موریہ خاندان اور مابعد کا زمانہ
۵۹	مسلمانوں کی آمد
۶۹	قرون وسطیٰ
۸۴	پوٹھوہاری زبان اور ادب
۱۰۴	اُردو ادب کی نشوونما
۱۴۴	اسلام آباد



۱۹۵۹ء میں فیڈرل کیپٹل کمیشن کا قیام عمل میں آیا تو نئے دارالحکومت کے بارے میں تحقیق و جستجو کے لئے بہت سے ارکان کو نامزد کیا گیا۔ ان ارکان میں راقم بھی شامل تھا مجھے جس کمیٹی میں کام کرنا تھا وہ تاریخ ادب، ثقافت، آثارِ قدیمہ اور لوک ورثے سے متعلق تھی۔ زبان، ادب، ثقافت پر تحقیق کا کام میرے سپرد ہوا اور ہماری کمیٹی نے تقریباً ایک سال کی سخت محنت کے بعد اپنا کام ختم کیا اور اپنی مبسوط رپورٹ پیش کی جسے کمیشن نے صرف سرکاری ضرورتوں کے لئے شائع کیا۔

سرزمین پوٹھوہار میری اُسی تحقیقی کام کا نتیجہ ہے۔ اس علاقے کے ادب، ثقافت، زبان اور شاعری کی تحقیق کچھ آسان کام نہ تھا مجھے بہت ساری تواریخی کتب کو کھنگال کر اپنے موضوع سے متعلق مواد جمع کرنا پڑا اس ضمن میں میرے لئے مفید ترین سلسلہ کتب ایلٹ اینڈ ڈاسن کا سلسلہ تھا جو تیس کتابوں پر مشتمل ہے اس سلسلے میں پرانی کتابوں کو انگریزی میں ترجمہ کیا گیا۔ تراجم کے علاوہ میں نے ”توزکِ بابری، ہمایوں نامہ اور توزکِ جہانگیری“ کے اصل متن میں خود پڑھے۔ موجد اروروی اے سمٹھ کتابوں سے بھی مدد ملی اور تاریخِ فرشتہ سے بھی کسی قدر معلومات حاصل ہوئیں۔ اے دُنی چند کا کیگو ہر نامہ ہر چند کہ محض روایات پر مبنی ہے لیکن پوٹھوہار کی تاریخ کے سلسلے میں اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

سرزمین کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا اب دوسرا ایڈیشن سترہ سال کے بعد شائع ہو رہا ہے اس دوران اس کی بہت مانگ رہی۔ اُمید ہے کہ موجودہ اشاعت اس مانگ کو پورا کرے گی۔ اس اشاعت میں مزید اضافے بھی کئے گئے ہیں

کرم حیدری ۱۹۵۹ء میں فیڈرل

محمد فاضل

پیش لفظ

جنوری ۱۹۶۰ء میں مجھے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں کراچی جانا پڑا۔ وہاں آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کے سیکرٹری سید الطاف علی صاحب بریلوی نے یہ خواہش ظاہر کی میں نہ صرف کانفرنس کے اُس عصرانہ میں شرکت کروں جو میرے کراچی جانے پر ترتیب دیا جا رہا تھا۔ بلکہ اُس موقع پر ایک تقریر بھی کروں۔ جب میں اُن سے تقریر کا موضوع پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ ویسے تو آپ جس موضوع پر چاہیں تقریر کر سکتے ہیں۔ لیکن ہماری خواہش یہ ہے کہ آپ پاکستان کے نئے دارالحکومت کے لئے منتخب شدہ علاقہ پوٹھوہار پر تقریر کریں۔ سرزمین پوٹھوہار کا ایک حقیر فرزند ہونے کی حیثیت سے میں اُن کی دعوت قبول کر لی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آل پاکستان ایجوکیشنل جیسے علمی ادارے کے صاحبِ علم و فضل مدعوین نے موضوع کی اہمیت و افادیت کے سبب نہ صرف مجھ جیسے پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل کی تقریر بڑے غور سے سنی۔ بلکہ جب میں نے

تقریر ختم کی تو متعدد حضرات نے ایسے پہلوں پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے سوالات بھی کئے۔ جو تقریر میں کسی قدر تشنہ رہ گئے تھے جب سے کرہ ارض وجود میں آیا ہے سرزمین پوٹھوہار اُسی وقت سے اُس کا ایک حصہ ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ماضی میں اسے وہ اہمیت حاصل نہ ہو سکی جو اُس کے محل وقوع اور قدرتی حسن کے لحاظ سے اُس کا حق تھی۔ یہاں تک قدرت نے اُس کے سوئے ہوئے بخت کو بیدار کیا اور ۱۹۵۹ء میں اُسے مملکت خداداد پاکستان کے دار الحکومت کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ اُس وقت سے ساری دُنیا کو بالعموم پاکستانیوں کو بالخصوص اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور ہر جگہ یہ معلوم کرنے کی خواہش اُبھر رہی ہے کہ سرزمین پوٹھوہار کہاں واقع ہے؟ ماضی میں اس کے حالات کیا رہے ہیں؟ اور اسے یہ اہمیت کیوں حاصل ہو گئی ہے؟

سرزمین پوٹھوہار کے حدود اربعہ کے متعلق کچھ مدت تک کوئی اختلاف نہ تھا۔ اور صدیوں سے لوگ صرف اسی علاقے کو پوٹھوہار سمجھ رہے تھے۔ جو ضلع جہلم کے مقامات سوہاوہ اور بکڑالہ کی درمیانی پہاڑی سے لے کر مشرق میں دریائے جہلم کے ساتھ ساتھ اور اُس سے آگے شمال میں پھیلے پہاڑوں کے دامن میں مارگلہ تک چلا گیا ہے۔ مغرب کی طرف اس کی حدود تحصیل راولپنڈی اور گوجرانوالہ کی حدود تک ہیں۔ چنانچہ مُغل شہنشاہ جہانگیر نے بھی پوٹھوہار کے علاقے کو ہتھیہ سے مارگلہ تک ہی قرار دیا ہے۔ کچھ عرصہ سے پوٹھوہار کی حدود بہت وسیع کر لی گئی ہے۔ اور دریائے جہلم اور دریائے اٹک کے درمیان واقع تمام علاقے کو پوٹھوہار کہا جانے لگا ہے۔ حالانکہ اس وسیع

علاقے میں چھچھ، دھنی، گھبھی، اور اعوان کاری کے الگ علاقے موجود ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ پوٹھوہار صرف دیہی علاقہ ہے۔ جس کی حدود اربعہ اوپر دی گئی ہے۔ جس سے سوہاؤہ کی پہاڑیوں سے مغرب کی جانب تحصیل جہلم کا علاقہ، پوری تحصیل گوجر خان، پہاڑی علاقہ کوچھوڑ کر پوری تحصیل کہوٹہ، اور مارگلہ سے مغرب کی طرف کا علاقہ چھوڑ کر پوری تحصیل راولپنڈی شامل ہیں، جہاں تک سرزمین پوٹھوہار کی تاریخ کا تعلق ہے اس سرزمین نے ماضی میں بہت انقلاب دیکھے ہیں اور یہ شمال مغرب کی طرف سے آنے والے تمام حملہ آوروں اور فاتحوں کی گذرگاہ رہی ہے۔ چنانچہ قبل از مسیح جہاں مشہور یونانی فاتح سکندر اعظم اس سرزمین تک پہنچا تھا۔ وہاں سلطان محمود غزنوی اسی سرزمین سے گذر کر گفر زار ہند پر حملہ آور ہوتے رہے پھر شہاب الدین بھی اسی سرزمین سے گذر کر دہلی پہنچے۔ اور بعض روایات کے مطابق وطن واپس جاتے ہوئے اسی سرزمین پر شہید کر دیئے گئے۔ بابر اور دورے مغل بادشاہ بھی اس سرزمین کو اپنے قدموں سے سرفراز کرتے رہے۔ اور نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی بھی یہیں سے گذر کر گئے۔ لیکن ان تمام اہم تاریخی واقعات کے باوجود اس سرزمین پر کبھی کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں ہوئی۔ البتہ اس علاقے پر صدیوں تک لگھڑ قبیلے کا اقتدار رہا اس دور کے آثار اب تک سرزمین پوٹھوہار پر پائے جاتے ہیں۔ سرزمین پوٹھوہار کو مملکت خداداد پاکستان کا مرکز منتخب کر لینے کے بعد اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ عوام کو اس کے ماضی اور حال سے روشناس کرایا جائے۔ اس لحاظ سے پروفیسر کرم حیدری اہل علم حضرات اور تمام پاکستانیوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس ضرورت کو پورا کرنے کی سعی کی ہے اس مختصر سی کتاب میں سرزمین پوٹھوہار کے ماضی اور حال پر سیر بحث حاصل

کی ہے اور واقعات سے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ موضوع کے بعض پہلوؤں پر روشنی نہ ڈال سکے ہوں۔ لیکن ان کی یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کوشش ہونے کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے۔ پھر انہوں نے آئندہ کے مورخین پر کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ بلکہ اُن کے لئے ایک راستہ متعین کر دیا ہے۔ جس پر چل کر وہ اپنی تحقیقات مکمل کر سکیں گے۔ مجھے توقع ہی نہیں یقین ہے کہ پروفیسر کرم حیدری کی یہ کوشش پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہوگی اور سرزمین پوٹھوہار کے حالات سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس سے بہت کچھ حاصل کر سکیں گے

پوٹھوہار کی حدود

مختلف لوگوں کے ذہنوں میں علاقہ پوٹھوہار کی حدود کے متعلق مختلف تصورات پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ جو ضلع راولپنڈی کی تحصیل گوجر خان کے رہنے والے ہیں۔ عام طور پر صرف اسی قطعہ زمین کو خالص پوٹھوہار کا علاقہ سمجھتے ہیں۔ جو راولپنڈی سے مشرق میں گزرنے والے دریائے سواں اور گوجر خان سے مشرق میں بہنے والے نالہ کشی کے درمیان واقع ہے۔ ان کی دانست میں اس علاقے سے باہر کا علاقہ پوٹھوہار نہیں۔ کچھ لوگ ضلع راولپنڈی کی دو تحصیلوں یعنی تحصیل گوجر خان اور تحصیل راولپنڈی اور تیسری تحصیل کہوٹہ کے میدانی حصے کو پوٹھوہار سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ پوٹھوہار کی حدود کا تعین لسانی اعتبار سے کرتے ہیں۔ کیونکہ راولپنڈی، گوجر خان اور کہوٹہ کے میدانی حصے کی بولی ساخت اور مزاج کے اعتبار سے قطع نظر، لب و لہجے کے اعتبار سے بھی ایک ہے۔ اور حقیقتاً اسی علاقے کی بولی کو ہم نیٹ پوٹھوہاری کا نام دے سکتے ہیں۔ تاہم آجکل کے پڑھے لکھے لوگ جو اس علاقے کی تاریخ سے بھی کسی قدر واقف ہیں۔ دریائے جہلم سے لے کر دریائے سندھ تک اور سری کی پہاڑیوں سے لے کر سون سیکس کی پہاڑیوں تک کے علاقے کو پوٹھوہار مانتے ہیں۔ ان لوگوں کے نقطہ نظر کے مطابق آب و ہوا، طبعی حالات، رسم و رواج اور لسانی ہم آہنگی ان لوگوں کے مزاج ان کو ہمارے

کی ہم رنگی کے اعتبار سے یہ تمام علاقہ ایک ہے۔ یہ درست ہے کہ زبان میں مٹھوڑا مٹھوڑا فرق موجود ہے۔ لیکن یہ فرق جزوی، فروعی اور محض لب و لہجے تک محدود ہے۔ جہاں تک زبان کی ساخت اور بن و ریشے کا تعلق ہے۔ کسی قسم کا کوئی بنیادی فرق نہیں۔ لب و لہجے میں فرق کا پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ لسانیات کا ایک تسلیم شدہ قاعدہ ہے کہ ہر بارہ میل کے بعد لوگوں کے لب و لہجے میں فرق آجاتا ہے۔ دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی ایسا نہیں جس کے رہنے والے تمام لوگ بالکل ایک ہی زبان، ایک ہی لب و لہجے سے بولتے ہیں۔ لب و لہجے کو تو جانے دیجئے مقامی رنگ کے زیر اثر محاورے تک میں تغیر و تبدل و وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں انگریزی ایک عالمگیر زبان ہے۔ اور دنیا کے کئی ممالک میں بولی جاتی

ہے۔ ان مختلف ممالک کی تحریر، روزمرہ اور محاورے میں بڑا واضح اور بین فرق ہوتا ہے۔ ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن خود انگلستان کا یہ عالم ہے کہ لندن میں بولی جانے والی انگریزی ویلزی میں بولی جانے والی انگریزی سے مختلف ہے۔ اور ویلزی میں بولی جانے والی انگریزی سکاٹ لینڈ میں بولی جانے والی زبان سے مختلف، یہاں تک کہ ٹھیک قسم کے ویش، سکاچ اور لندن کے لوگوں کو ایک دوسرے کی زبان بخوبی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ یہی حال عربی کا ہے۔ مشرق وسطے کی یہ زبان مختلف علاقوں میں مختلف انداز میں بولی جاتی ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں سوڈا اور حیرال کے لوگ بولپشتو بولتے ہیں۔ بنوں، کوہاٹ اور ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے اُس سے مختلف پشتو بولتے ہیں۔ پنجابی، مشرقی پنجاب اور مغربی پاکستان کے وسیع علاقوں کی زبان ہے۔ لیکن گجرات میں بولی جانے والی پنجابی اُس سے کہیں مختلف ہے جو جالندھر اور ہوشیار پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

اس اصول کو پیش نظر رکھ کر سطح مرتفع پوٹھوہار کے مختلف حصوں کی بولی کا جائزہ لیا جائے تو ہر چند کہ اس میں مکمل طور پر یکسانیت نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دریائے سواں کے کنارے سے بولی جانے والی زبان تو پوٹھوہار سے ہے لیکن سندھ اور جہلم کے کنارے

بولی جانے والی زبان پوٹھوہاری نہیں کوئی اور ہے۔

ایسے لوگ جو علاقائی وحدتوں کے اصول سے ناواقفیت کی بنا پر پوٹھوہار کو دو، اڑھائی تسیلوں میں محدود کر دینے کے حامی ہیں۔ اس تحدید کے حق میں عام طور پر یہ دلیل لاتے ہیں کہ اگر ہم جہلم اور سندھ اور مری اور سون سکیر کے درمیانی تمام علاقے کو پوٹھوہار کہیں تو دھتی، گھیبی، ونہار اور چھپر وغیرہ کے مختلف علاقوں کی تخصیص کیونکر ہو سکے گی۔ ان لوگوں کی یہ دلیل ایک معمولی سی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ورنہ یہ بات واضح ہے کہ پوٹھوہار ایک وسیع تر علاقے کا نام ہے۔ اور دھتی، گھیبی، ونہار چھپر وغیرہ اس وسیع تر علاقے کے محدود حصے ہیں۔ جس طرح ایک شہر کے کئی محلے ہوتے ہیں۔ اور ہر محلے کا نام اور محل وقوع الگ ہوتا ہے۔ ان محلوں کی اپنی اپنی انفرادیت بجا لیکن نہ تو کسی ایک محلے کو پورے شہر کا نام دیا جاسکتا ہے۔ نہ پورے شہر کو ایک محلے کے نام سے پکارا جاسکتا ہے۔

تاریخی شواہد کے اعتبار سے بھی پوٹھوہار عام طور پر اسی علاقے کا نام رہا ہے جو دریائے جہلم اور دریائے سندھ کے درمیان واقع ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے بھی اس علاقے کو پٹوار کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اور مغلوں کے عہد میں بھی اسے پوٹھوہار ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا۔ اس علاقے میں چونکہ گکھڑ قبیلے کے سردار حکمران تھے۔ اس لئے اسے گکھڑوں کا علاقہ بھی کہا جاتا تھا۔ گکھڑوں کی نسبت سے بعض اوقات پوٹھوہاری زبان کو بھی گکھڑوں کی زبان کہا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں شہنشاہ جہانگیر کی خود نوشت، سوانحہ مری، "توزک جہانگیری" سے نہایت دلچسپ حقائق دستیاب ہوتے ہیں۔ تخت نشینی کے دوسرے سال جہانگیر نے دہلی سے کابل کا سفر کیا تھا۔ اس سفر کے دوران وہ اس علاقے میں سے گزرا تو اُس نے نہایت دلچسپ حالات سپرد قلم کئے۔ جو علاقہ پوٹھوہار کے متعلق ہمیں بہت سے تاریخی حقائق سے روشناس کرتے ہیں۔ جہانگیر لکھتا ہے۔

میکم محرم بروز ہفتہ میں نے دریائے بے ہت (جہلم) کے کنارے سے گزرا

کی طرف کوچ کیا.....“

”چونکہ یہ علاقہ گکٹروں کے علاقے سے ملحق ہے جو ایک شہر پسند اور شوریدہ سر قوم ہے، اس لئے شیر خان افغان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن کو مرعوب کرنے اور اُن پر قابو پانے کے لئے ایک قلعہ تعمیر کرے۔“

”محترم کی چوتھی تاریخ کو میں پونے پانچ کوس سفر کر کے قلعہ کے مقام پر پہنچا۔ گکٹروں کی زبان میں قلعہ پہاڑی کو کہتے ہیں۔ اس جگہ سے میں بھکڑا روانہ ہوا۔ گکٹروں کی زبان میں بھکڑا ایک بھوٹی سنی بھاڑی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ سفید رنگ کے بے بو کے پھول لگتے ہیں۔ قلعہ سے بھکڑا ایک کاسفر ایک خشک نالے کی گزر گاہ کے راستے طے ہوا۔“

”پھٹی محرم بروز بھرات میں نے ہتھیہ کے مقام پر قیام کیا۔ اس مقام کو ہتھیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ اسے جی نام ایک گکٹر سردار نے آباد کیا تھا۔ اس گکٹر سردار کا اصلی نام ہمت خان تھا۔ اور اپنے تن و توش کی وجہ سے سلطان ہاتھی خان مشہور تھا۔ یہ سردار شہنشاہ بابر اور ہمایوں کا ہم عصر تھا۔ چنانچہ پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر کے ساتھ میدان جنگ میں شامل ہوا تھا۔ زخمی ہونے سے لے کر مار گئے تک کا علاقہ پوٹھوہار کہلاتا ہے۔ اس علاقے میں بہت کم کوئے ملتے ہیں۔ رہتاس اور ہتھیہ کا درمیانی علاقہ بگیالوں کا ہے جو اسی نسل سے ہیں اور گکٹروں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔“

گویا شہنشاہ جہانگیر نے ہتھیہ سے لے کر مارگلہ تک کے علاقے کو پوٹھوہار کہا اور چونکہ رہتاس سے ہتھیہ تک کا علاقہ بھی بگیال قبیلے کا ہے جو گکٹروں ہی کی ایک شاخ ہے اس لئے گویا رہتاس سے لے کر مارگلہ تک کا علاقہ اس زمانے میں پوٹھوہار کا علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ فی الواقعہ جہانگیر نے اس علاقے کو پوٹھوہار کہا ہے جس میں گکٹر قوم آباد اور حکمران تھی اور چونکہ مارگلہ سے آگے گکٹر قوم کا عمل دخل ختم ہو جاتا ہے۔ اور گکٹروں، اعوانوں وغیرہ قبائلی کی عملداری تھی۔ اس لئے اُس نے اس علاقے کو پوٹھوہار سے الگ سمجھا ہے۔ حالانکہ مارگلہ سے

آگے دیا نئے سندھ تک کا علاقہ بھی سطح مرتفع پوٹھوہار ہی کا ایک اہم حصہ ہے۔
 جب ۱۸۴۹ء میں انگریزوں کی حکومت سالتی پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے
 میں بھی قائم ہوئی تو انہوں نے کچھ عرصے کے بعد ۱۸۵۴ء میں اس علاقے میں پہلا بندوبست
 کرایا۔ چنانچہ راولپنڈی، گوجران، چکوال اور ملحقہ علاقوں کا بندوبست گیان سنگھ نامی ایک
 تحصیلدار نے کیا۔ گیان سنگھ نے ایک کتاب بھی اس علاقے کے متعلق لکھی جس کا قلمی نسخہ
 راقم الحروف کی نظر سے گزرا ہے۔ اس کتاب میں وہ اس تمام علاقے کو پوٹھوہار اور اس کی
 زبان کو پوٹھوہاری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ پوٹھوہاری زبان کے بہت سے الفاظ اور عادات
 بھی اس نے درج کئے ہیں۔ ان الفاظ اور عادات کی صورت اور معانی آج بھی بعینہ ہی
 ہیں جو آج سے ایک سو سال پہلے تھے۔ گیان سنگھ نے اس کتاب میں گکٹر قوم کی مختصر سی تاریخ
 بھی دی ہے۔

راولپنڈی کو پوٹھوہار کے مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہے اور یہ حیثیت کسی قریبی
 زمانے سے نہیں بلکہ سینکڑوں سالوں سے ہے۔ یوں تو قدیم ترین زمانے سے اس مقام پر
 جہاں آج کل راولپنڈی کا شہر آباد ہے۔ انسانی آبادی رہی ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۵ء کی
 کھدائی میں ٹوپی گاؤں سے جہاں اب ایوب نیشنل پارک بنایا گیا ہے اور راولپنڈی جیل کے قریب
 دھوار کے علاقوں سے ایسے آثار قدیمہ دستیاب ہوئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہزاروں سال
 پہلے بھی یہ مقام انسانوں کا مسکن رہا ہے۔ لیکن جب سے مسلمانوں نے سرزمین پاک و ہند میں
 قدم رکھا ہے ہمیں اس شہر کے وجود سے متعلق تو ادنیٰ شواہد ملتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں
 کی آمد سے پہلے بھی یہاں ایک شہر تھا جو گنچ نامی ایک راجہ نے آباد کیا تھا۔ اس راجہ کے نام کی
 نسبت سے اسے گنچ پور یا گنچی پور کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں
 اس شہر کا نام اکبر آباد تھا اور سلطان نے اسی شہر میں ۱۱۸۰ء میں ایک فرمان کے ذریعے
 پوٹھوہار کی حکومت گکٹر سردار سلطان کے گورنر المعروف گکٹر شاہ کے سپرد کی تھی۔ ۱۱۸۰ء

امر قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ اُس زمانے میں جبکہ مسلمانوں کے قدم پہلی بار ارض ہندو پاک کے اس حصے میں پہنچے تھے۔ اس شہر کا نام اکبر آباد (جو ایک خالص اسلامی نام ہے) ہوا ہو۔ غالب قیاس یہی ہے کہ یہ روایت کیگو ہر نامہ کے مصنف و فی چند کے زرخیز دماغ کی اختراع ہے۔ جس نے اپنے گکٹر محمد وحین کو خوش کرنے کے لئے اسے وضع کیا ہو گا۔

البتہ اُس زمانے میں راول ایک بڑا قصبہ تھا۔ جس میں اسی نام کا قبیلہ آباد تھا۔ اس قصبے کا باقاعدہ ذکر اُس زمانے کی تواریخ میں ملتا ہے۔ ان تاریخی کتب کے مطابق سلطان الشہداء سالار مسعود غازی جو سلطان محمود کے ایک مشہور جرنیل سالار ساہو کے بیٹے اور خود سلطان کے بھانجے تھے۔ جس زمانے میں اپنے باپ سے ملنے اجمیر سے قلعہ کابلز واقع کشمیر کی طرف گئے تو وہ اس علاقے سے گزرے تھے، انہوں نے یہاں کے حکمران راجہ ستوگن کے اصرار پر راول میں دو دن قیام بھی کیا۔ مسلمان مؤرخین نے لکھا ہے کہ راجہ ستوگن کی لڑکی سلطان محمود غزنوی کے وزیر خواجہ حسن میمنڈی کے لڑکے کے حرم میں تھی۔ اس قرابت داری کی وجہ سے ستوگن حسن میمنڈی کا بڑا وفادار دوست تھا اور چونکہ حسن میمنڈی سالار ساہو کا جانی دشمن تھا۔ اس لئے اُس نے دھوکے سے سالار ساہو کے بیٹے سالار مسعود غازی کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش بھی کی۔ اُس نے بڑی منتوں اور خوشامدوں سے سالار مسعود غازی کو اپنے ہاں مٹھانے اور کھانا کھانے کی دعوت دی۔ مگر انہوں نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ بالآخر اُس نے تنھے کے طور پر کچھ زہریلی مٹھائی اُن کے ہاں بھجوائی جس کے متعلق سالار مسعود کو پتہ چل گیا۔ اور یہ مٹھائی پھینکوا دی گئی۔ تاریخ مسعودی میں جو سلطان الشہداء کی سوانح عمری ہے یہ واقعہ نہایت تفصیل سے درج ہے۔

شہنشاہ جہانگیر نے اپنی توڑک میں جس مقام کو راولپنڈی کہا ہے اُس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مقام موجودہ راولپنڈی کی بجائے راول ہی کا قدیمی قصبہ تھا۔ اس خیال کی تائید میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جہانگیر نے راولپنڈی کے قریب ایک بہت بڑے مٹلاب کا ذکر کیا ہے جس کے متعلق وہاں کے لوگوں کا خیال تھا کہ اس میں بڑے بڑے مگرچھ

رہتے ہیں۔ اس لئے کوئی مقامی آدمی اس تالاب میں داخل ہونے کی جرأت نہ کرتا تھا اور یہ تالاب وہی تالاب ہے جو آج بھی راول کے قریب نالہ کورنگ میں موجود ہے۔ اس تالاب کے مقام پر اب، راول ڈیم زیر تعمیر ہے۔ تاہم اس خیال کی تاریخی شواہد سے تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جہانگیر کے عہد حکومت سے تقریباً پچاس برس پیشتر شیر شاہ سوری نے مرشد آباد سے پشاور تک جو سڑک بنوائی تھی وہ تقریباً وہی ہے۔ جو آجکل گرینڈ ٹرنک روڈ کہلاتی ہے۔ شیر شاہی زمانے کے آثار سے یہ امر واضح ہے کہ یہ سڑک گوجر خان سے مندرہ، مندرہ سے روات اور روات سے موجودہ راولپنڈی میں سے ہوتی ہوئی آگے کو نکلتی تھی۔ اور اس طرح راول کاقدیمی قصبہ اس سڑک سے نو، میل پر سے رہ جاتا تھا اس لئے جس مقام کو جہانگیر نے راولپنڈی کہا ہے وہ یقیناً وہی تھا جہاں آج بھی راولپنڈی شہر آباد ہے۔

مغلوں کے عہد میں راولپنڈی کی حیثیت ایک نہایت معمولی سے قصبے کی رہی لیکن سکھوں کے مختصر سے دور حکومت میں اس کی اہمیت میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سکھوں نے کشمیر جانے کے لئے مغلوں کے زمانے کے طویل راستے کی بجائے جو حسن ابدال سے ایبٹ آباد ہوتا ہوا مظفر آباد پہنچتا تھا۔ راولپنڈی سے مری کی پہاڑیوں میں سے گزرتا ہوا گولہ لے تک پہنچنے والا راستہ اختیار کیا۔ سکھوں کو یہ راستہ اختیار کرنے کی خاص طور پر اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ انہوں نے مسلم آبادی کے وسیع و عریض علاقے پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لئے جگہ بہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کی تھیں جن کے درمیان مسلسل اور متواتر باہمی رابطہ قائم رکھنا ضروری تھا۔

اغلباً اسی زمانے میں پرمشور بار کے علاقے میں ہندوؤں اور سکھوں کا اقتصادی تسلط بھی مکمل ہوا۔ یوں تو مسلمانوں کی طویل حکومت کے زمانے میں بھی تجارت اور تجارت کے واسطے ملک کی اقتصادیات پر ہندوؤں کا قبضہ رہا۔ حتیٰ کہ مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ بعض اوقات ساہوکاروں سے یہ قرض لے کر کاروبار حکومت کی گاڑی دھکیلتے تھے۔ لیکن

مُغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اس میدان میں ہندو سکھ سرمایہ داروں نے کھلی لوٹ چھا دی۔ چنانچہ پوٹھوہار کے مختلف اہم قصبوں میں بھی حکومت کے بل بوتے پر سکھوں کے خاندان آباد ہوئے جنہوں نے رفتہ رفتہ علاقے کی تمام تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان سامہوکاروں نے روپے پیسے کے بل بوتے پر مسلمان زمینداروں کی زمینیں بھی ہتیا لیں اور سودر سود کا ایسا چکر چلایا کہ بعض مقامات پر ہندو، سکھ وکاندار بڑے بڑے جاگیردار بن گئے اور بڑے ٹھاٹھاٹ سے اپنی زندگی گزارنے لگے۔ اس لحاظ سے ضلع راولپنڈی میں کلر نامی قصبہ خاص طور پر مشہور ہے جہاں بیدی سکھوں کا ایک خاندان آباد تھا۔ اس خاندان کی ماہ و شمت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں روڑسائے پنجاب کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں ضلع راولپنڈی کے صرف دو نام تھے جن میں سے ایک نام اس خاندان کے سربراہ کرنل گورنخیش سنگھ بیدی کا تھا کلر کے علاوہ ضلع راولپنڈی میں مندرہ، بسائی، ہرنال، سکھو، دولتالہ، متھوہا خالصہ، چوہا خالصہ گوجر خان، کوری اور دیول کے قصبات میں اور اسی طرح ضلع کیمبل پور کے کئی ایک قصبات میں ہندو سکھ اقتصادی اعتبار سے پوری طرح چھائے ہوئے تھے۔ ضلع راولپنڈی میں مندرہ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہرنال نامی ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے جو مشہور اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کی جنم بھومی ہے۔ اس گاؤں میں ماسٹر تارا سنگھ کا خاندان ۱۹۵۰ء تک آباد رہا۔

انگریزوں کی آمد کے بعد راولپنڈی سے کشمیر جانے والا راستہ ایک باضابطہ شاہراہ کی صورت اختیار کر گیا۔ اس شاہراہ پر مری کے پرفضا اور صحت بخش مقام کی داغ بیل ۱۸۵۷ء میں ہی پڑ گئی تھی۔ انگریزوں کو شمال مغربی ہندوستان کے علاقوں پر اپنے تسلط کو مضبوط رکھنے کے لئے ایک بڑا فوجی مرکز قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے راولپنڈی کے مقام پر اپنا چوم تھا لیکن سب سے بڑا اور سب سے اہم فوجی مرکز قائم کیا جو نارتھ

کمانڈر کھلاتا تھا۔ مری کے ارد گرد کی پہاڑیوں میں مختلف مقامات پر چھاؤنیاں بنائی گئیں۔ جہاں گورہ فوج کے سپاہی موسم گرما گزارتے تھے۔ راولپنڈی کو پہلے ایک ضلع کا اور بعد ازاں ڈویژن کا صدر مقام بنایا گیا۔ نارمٹھ ویسٹرن ریلوے کی تعمیر کے بعد راولپنڈی کی اہمیت میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ چنانچہ یہاں ایک بہت بڑا ریلوے ورکشاپ قائم ہوا۔ جس میں ہزاروں مزدور کام کرنے لگے۔ یہ ورکشاپ کچھ عرصے کے بعد لاہور چلا گیا۔ لیکن اس کی یادگار کے طور پر راولپنڈی شہر کا ایک محلہ ”ورکشاپیاں محلہ“ کے نام سے آج تک موجود ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ناردرن کمانڈ کی عمارات میں پاکستانی افواج کے مرکزی دفاتر کا کام کرنے لگے جس سے اس شہر کی اہمیت دو چند ہو گئی۔ ملک کی صنعتی ترقی کا ایک قلیل سا حصہ بھی اسے حاصل ہوا اور چند ایک کارخانے یہاں بھی قائم ہو گئے۔ چونکہ یہاں مزدور سستا ہے۔ اور خام مواد بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے ان کارخانوں کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے۔

کارخانوں کے قیام سے جہاں ایک طرف روزگار کے مواقع بڑھ گئے۔ وہاں آبادی میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ یہ شہر جو تقسیم ہند سے پہلے تین میل سے زیادہ طول و عرض نہ رکھتا تھا، اب تقریباً دس میل کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کے پھیلاؤ میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس کی قسمت نے یکایک ایک بہت بڑا پلٹا کھایا اور اس کے قریب ہی نئے دارالحکومت کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ آج کل یہ مرکزی دارالحکومت ہونے کی وجہ سے پاکستان کا اہم ترین شہر بن گیا ہے اور آئندہ چل کر اسے جو حیثیت حاصل ہوگی وہ انظر من الشمس ہے۔

زمانہ ماقبل تاریخ

قدیم ترین زمانے میں کُرد ارض کے تین مقامات پر ایسی اقوام نمودار ہوئیں جن کی ذہنی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی کے متعلق ہم پورے وثوق سے تو کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن عصر جدید کی علمی تحقیقات اور سطح زمین کے اندرونی طبقات کی کھدائیوں سے ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچے ہیں کہ ان لوگوں کی ذہنی، ثقافتی اور تہذیبی سطح نہایت بلند تھی یہ تین مقامات وادی سندھ، وادی فرات اور وادی نیل تھے۔ اور وہ زمانہ جس میں ان مقامات کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو انتہائی مہذب اور متہذبن بنایا ہے۔ ۵۰۰۰ ق م سے ۲۰۰۰ ق م تک پھیلا ہوا ہے۔ تین ہزار سال کے اس طویل عرصے میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ کتنے تہذیبی ادوار آئے اور تمدنی جوار بھلے کا کیا انداز رہا۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان تینوں علاقوں کی تہذیبوں میں باہمی ربط و ضبط بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر تھا تو اس ربط و ضبط کی نوعیت کیا تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ تہذیبیں ایک

دوسری پر اثر انداز بھی ہوئیں یا نہیں اور اگر ہوئیں تو کس طرح سے۔ البتہ مصر اور عراق کی تہذیبوں کے باہمی میل جول کے متعلق شواہد موجود ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اپنے تہذیبی عروج، اپنی قوت و شہمت اور اپنی دولت کے بل بوتے پر مصر کے فراعنہ اور بابل اور نینوا کے بادشاہ خدا کی تک کے مدعی ہوئے اور یہی وہ زمانہ تھا جب ان سرزمینوں میں خدا کی طرف سے بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر بھیجے جاتے رہے جو ان سرکش اور مغرور انسانوں کے زعمِ خدا کی کو توڑ کر خلقِ خدا کو ان کے ظلم و ستم سے نجات دلاتے رہے۔ ہمارا خیال بلکہ یقین ہے کہ وادی سندھ میں بھی ضرور انبیاء کا نزول ہوتا رہا ہوگا لیکن چونکہ اس کے متعلق ہماری مذہبی روایات خاموش ہیں اور ہندوستان کی پُرانی کتابوں میں بھی کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ لہٰذا ہم اس معاملے میں کسی قسم کی رائے زنی سے معذور ہیں۔ جدید ترین طبقاتی تحقیقات کی روش سے دریائے سواں کی وادی میں ایسے انسانی ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں جن کی قدامت دس ہزار سال سے بھی زیادہ متعین کی گئی ہے۔ البتہ ان ڈھانچوں کے علاوہ کسی قسم کے قابلِ لحاظ تمدنی یا تہذیبی آثار دستیاب نہیں ہوئے۔ تاہم ۱۹۲۸ء میں

جیولاجیکل سروے آف انڈیا کے سربراہ ڈی۔ این۔ واڈیا کو دریائے سواں کے کناروں سے پتھر

کے زمانے کے اوزار ملے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں YALE CAMBRIDGE EXPEDITION نے دریائے سندھ اور دریائے سواں کے درمیانی حصے میں تحقیقات کی اور اسے بھی پتھر

کے زمانے کے کچھ آثار اور اوزار ملے۔ تمدنی آثار زیادہ تر وادی سندھ کے زیریں حصوں

میں دستیاب ہوئے ہیں۔ جہاں زمین کے اندر کھدائیاں کرنے سے دو قدیم شہر موجود

اور ٹہرپور برآمد ہوئے ہیں۔ ان دونوں شہروں میں عمارات کی ساخت اور گلی کوچوں کی ترتیب

قریب قریب یکساں ہے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ ان کا زمانہ بھی ایک ہی تھا۔ اور ہو سکتا

ہے کہ ان میں بسنے والی قومیں بھی ایک ہی ہوتی ہوں۔ موجودہ دارو میں طبقات الارض کے

ماہرین نے تحقیقات زیادہ تفصیل سے کی ہے۔ اور وہاں تمدنی آثار بھی کچھ زیادہ ہی دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ جس قدیم تہذیب کے آثار ہمیں موجودار و اور ہڑپہ میں ملے ہیں اس کا عمل و عمل علاقہ پوٹھوہار سمیت تمام وادی سندھ میں تھا۔ البتہ یہاں بڑے شہروں کے آثار دستیاب نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس علاقے میں لوگوں کی بود و باش بڑے شہروں کی بجائے دیہات میں تھی۔ یا اگر یہاں بڑے شہر ہوئے ہوں تو وہ سطح زمین کے نیچے اتنی گہرائی میں دبے ہوں کہ ہماری آن تک رسائی ممکن نہ ہو۔

موجودار و اور ہڑپہ میں جو طبقاتی تحقیقات ہوئی ہیں اس سے اس علاقے کے اس زمانے کے تمدنی حالات ہمارے سامنے آئے ہیں، یہ لوگ انتہائی تمدن تھے اور حفظانِ صحت کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہ تمام علاقہ نہایت زرخیز تھا۔ گندم اور کپاس کی پیداوار عام تھی۔ لوگوں کی بنیادی خوراک گندم تھی۔ لیکن دوسری اجناس بھی مستعمل تھیں۔ گوشت خوری کا رواج عام تھا۔ زیادہ تر سوتی کپڑے پہنے جاتے تھے۔ لیکن موسم سرما میں اونی کپڑے سے بنا ہوا لباس بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ زیورات پہننے کا شوق ہمہ گیر تھا۔ عورتوں کی طرح مرد بھی ہار، بازو بند، چوڑیاں اور انگوٹھیاں پہنتے تھے۔ لیکن تمھنیاں، بالیاں، بڑاؤ، پیٹیاں اور پازیبیں صرف عورتوں کے پہناوے تھے۔ یہ زیورات، سونے، چاندی، تانبے، لہ متھی دانت، مونگے اور مختلف قیمتی پتھروں سے بنائے جاتے تھے۔ موجودار و میں جو زیورات دستیاب ہوئے ہیں وہ نہایت نفیس اور کاریگری کے عمدہ نمونے ہیں۔ گھروں میں استعمال ہونے والے برتن زیادہ تر مٹی کے ہو کر ملتے تھے۔ لیکن مختلف دھاتوں بالخصوص تانبے، کانسی اور چاندی کے برتن بھی بنائے جاتے تھے روزمرہ کے استعمال کی بعض دوسری اشیاء کنگھیاں، سونیاں، کلہاڑیاں، رندے، پھریاں، درانتیاں، مچھلی کے کانٹے اور آستہ

بھی برآمد ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کے کھلونے بھی پائے گئے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ فارغ الحال اور مرقہ الحال تھے۔ کسی تمدن معاشرے میں جو برائیاں، بالعموم پیدا ہو جایا کرتی ہیں وہ بھی ان میں موجود تھیں۔ ان لوگوں کو صرف رقص کرنا ہی سے شغف نہ تھا بلکہ جوا کھیلنے کی و بار بھی عام تھی۔ چنانچہ ان کھدائیوں میں جوا کھیلنے کے پائے بھی برآمد آئے ہیں۔

رقص و موسیقی کے علاوہ یہ لوگ دوسرے فنون لطیفہ کے دلدادہ بھی تھے۔ ان فنون لطیفہ میں نقاشی اور بت گری سرفہرست ہیں۔ نقاشی میں ان لوگوں کی مہارت کا اندازہ ان مہروں سے ہوتا ہے جو ان کھنڈروں سے برآمد ہوئی ہیں۔ ان مہروں کی تعداد پانچ سو کے قریب ہے۔ ان پر عجیب و غریب جانوروں کی تصاویر کندہ ہیں۔ جن میں سے بعض جانور حقیقی اور بعض تخیلی ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ یہ مہریں تجارتی اغراض کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ ان مہروں پر ان لوگوں کی زبان اور حروف میں الفاظ اور عبارات بھی منقوش ہیں۔ لیکن تاحال محققین اس زبان کو پڑھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ حالانکہ اسی زمانے کے مصری اور آشوری رسم الخط پڑھے جا چکے ہیں۔ پھر بھی ان تحریرات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ فن تحریر سے واقف تھے۔ افسوس ہے کہ یہ زبان اور اس زبان کا رسم الخط ان لوگوں کے ساتھ ہی نابود ہو گئے۔ اس کا بہت بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس برصغیر کے رہنے والے تقریباً ایک ہزار سال تک رسم الخط سے محروم رہے۔ لہذا اس تمام درمیانی عرصے میں کسی قسم کی علمی ترقی نہ ہو سکی۔ اس زمانے میں لوگوں کی معیشت کا انحصار زیادہ تر کاشتکاری پر تھا۔ لیکن گھر گھر دستکاریاں اور حرفیں بھی عام تھیں۔ ظروف سازی کی دستکاری عام اور مقبول ترین تھی۔ کہاروں کا چاک ایجاد ہو چکا تھا جس کی مدد سے مٹی کے نہایت خواہ صورت بدتن بنائے جاتے تھے۔ یہ چیز یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ اس چاک

کی ابتدا کس ملک میں ہوئی۔ کیونکہ اسی زمانے کے جو کھنڈرات ایران اور عراق کے ملکوں میں برآمد ہوئے ہیں۔ اُن میں بھی مٹی کے نہایت خوبصورت اور خوشنما برتن دستیاب ہوئے ہیں بلکہ ایران کے صوبہ کاشان کے علاقے کے برآمد شدہ برتنوں پر تو گلکاری کا کام بھی موجود ہے۔ کمہاروں کے علاوہ کپڑا بننے والے، دھاتوں کا کام کرنے والے، معمار، ترکھان، سنار اور ہاتھی دانت کا کام کرنے والے بھی اس معاشرے کے اہم کارکن افراد میں سے تھے۔ اس علاقے کا فنِ معمارِ عراق اور مصر کے ہم عصر فنِ معاری سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ کیونکہ یہاں عمارتوں میں مجسٹوں میں پکائی ہوئی اینٹیں استعمال کی جاتی تھیں، درانحالیکہ اُن ممالک میں صرف دھوپ میں سکھا کر اینٹیں کام میں لائی جاتی تھیں۔ پکی اینٹوں کی ایجاد کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وادی سندھ کا تمام تر علاقہ موطنِ سنون ہواؤں کے خطے میں واقع ہے۔ اس لئے یہاں بارش کا کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ عراق اور مصر میں بارش شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں کچی اینٹوں سے ہی کام چل جاتا تھا۔ اُس زمانے میں انسان دھات کے استعمال سے واقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ جو آثارِ ملے ہیں۔ اُن میں سونے، چاندی، تانبے، کانسی اور اسی قسم کی دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی چیزیں موجود ہیں لیکن لوہے کی دریافت اُس وقت تک نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوہے کی بنی ہوئی ایک چیز بھی نہیں ملی۔

طبقاتی تحقیقات سے ان لوگوں کے مذہب کے متعلق بھی بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ نقاشی اور بت تراشی کا رواج محض فنونِ لطیفہ کے طور پر ہی نہیں تھا بلکہ ان چیزوں کا قریبی تعلق اُن کے مذہبی خیالات اور معتقدات سے بھی تھا۔ مادِ دیوی کے پرستش کا رواج عام معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بہت سے چھوٹے بڑے بت دستیاب ہوئے ہیں۔ اس دیوی کے علاوہ ایک دیوتا کے بت بھی ملے ہیں۔ یہ دیوتا ابتدائی ویدک زمانے کے شیو دیوتا کا پیشرو سمجھا جاتا ہے۔ یہ بت یوگیوں کے انداز

میں بیٹھا ہوا پایا گیا ہے اور اس کے تین چہرے اور سر کے لباس میں سے دو ابھرے ہوئے سینگ ہیں۔ اس کے ارد گرد جنگلی جانور بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دیوتا کا یہ تصور بعد کے شیو دیوتا کے تصور سے نہایت قریب ہے۔ کیونکہ شیو دیوتا کو مہا یوگی اور پاسوتی یعنی جانوروں کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کے علاوہ یہ لوگ اغلباً قدیم چینوں کی طرح اپنے آباؤ اجداد کے بتوں کی پرستش بھی کیا کرتے تھے۔ مزید برآں وہ پتھروں، درختوں، جانوروں اور سانپوں کی پوجا بھی کرتے تھے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق یہ چیزیں ارواح کی مظاہر یا مسکن تھیں۔

آریاؤں کی آمد

آریاؤں کی آمد کا صحیح زمانہ آج تک متعین نہیں ہو سکا۔ بعض یورپی محققین نے اسے دو ہزار قبل مسیح سے لے کر ایک ہزار سال قبل مسیح تک لکھا ہے لیکن ان کے بیانات افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ اب یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے۔ کہ پانچ ہزار سال قبل مسیح سے دو ہزار سال قبل مسیح تک کا زمانہ قدیم وادی سندھ کی تہذیب کا زمانہ ہے۔ اس تہذیب کے ڈانڈے اُس زمانے کی وادی فرات اور وادی نیل کی تہذیب سے ملتے ہیں۔ البتہ یہ امر قرین قیاس اور بڑی حد تک درست ہے کہ آریائی قبائل کی ہندوستان میں آمد کا سلسلہ تین ہزار قبل مسیح کے قریب شروع ہو گیا تھا۔ کئی سو سال تک قبائل کی آمد کا یہ سلسلہ آہستہ آہستہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ ہزار سال کی مدت میں یہ قبائل تقریباً تمام وادی سندھ پر چھا چکے تھے۔ جوں جوں نئے قبائل کی آمد ہوتی تھی۔ پرانے قبائل مشرق اور جنوب کی طرف سرکتے جاتے تھے۔ یہ قبائل مقامی لوگوں کو جنہیں یہ واسیو یا غلام کہتے تھے۔ تقریباً نیست و نابود کرتے چلے گئے۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان میں آپس

میں بھی خانہ جنگی ہوتی رہتی تھی اور شکست کھانے والے قبائل فتح مند قبائل کے لئے جگہ خالی کرتے ہوئے آگے کو نکلتے چلے جاتے تھے۔

آریائی قبائل پہلے پہل دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر آباد ہوئے۔ اس دریا کو انہی لوگوں نے سندھ کا نام دیا۔ اُن کی زبان میں سندھو تیز رفتار گھوڑے کو کہا جاتا تھا۔ یہ نام غالباً دریائی تیز رفتاری کی بدولت اسے ملا۔ جب دریائے کنارے پر آبادی بڑھ گئی تو کچھ قبائل بائیں کنارے کی طرف منتقل ہوئے اور وہاں سے سطح مرتفع پوٹھوہار کی طرف بڑھنے لگے۔ اس سطح مرتفع پر مکمل طور پر قابض ہو جانے کے بعد ان لوگوں نے وادی سندھ کے جنوبی حصوں کی طرف پیش قدمی کی اور وادی سندھ کے عظیم اُشان تہذیبی مرکز موہنجودارو کی طرف بڑھنے لگے۔ موہنجودارو میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں اُن سے اس شہر کے کھنڈر کئی طبقوں میں برآمد ہوئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر کم و بیش پچھلا بار برباد ہو ہو کر آباد ہوتا رہا۔ یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ یہ بربادیاں حملہ آوروں کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوتی رہیں یا دوسرے قدرتی عوامل مثلاً سیلاب وغیرہ ان کا سامان مہیا کرتے رہے۔ لیکن جب ۱۵۰۰ ق م کے قریب یہ شہر آخری باہر برباد ہو کر پیوندِ خاک ہوا تو اس بربادی کے ذمہ دار آریائی حملہ آور تھے۔ اس شہر کے سب سے اوپر والے طبقے کی کھدائی سے یہ امر پائیے ثبوت کو پہنچ چکا ہے۔ کہ آخری لڑائی جس میں موہنجودارو مکمل طور پر شہا ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وادی سندھ کی تہذیب بھی مٹ گئی، نہایت خوفناک قسم کی تھی۔ آریائی قبائل ان قدیم باشندوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تنومند، جنگجو اور ماہر آلاتِ جنگ تھے۔ علاوہ بریں وہ وحشی اور غوروار بھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر پر یہ آخری حملہ بالکل اچانک کیا گیا جس کی وجہ سے یہاں کے تمام امن پسند شہریوں کو جن میں جوان، بوڑھے، عورتیں اور بچے سبھی شامل تھے۔ مدافعتِ جنگ کے لئے گھروں سے باہر نکلنا پڑا اور شہر کے گلی کو چوں میں دست بدست جنگ ہوتی رہی۔ اس جنگ میں ہر عمر کی عورتیں، مرد اور بچے کام آتے چلے گئے۔

آریاؤں نے نہایت بیدردی سے مقامی باشندوں کا قتل عام کیا، چنانچہ ساڑھے تین ہزار سال بعد جب اس مقام کو کھودا گیا تو ان سب کی ہڈیوں کے ڈھانچے بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے پائے گئے۔

آریاؤں کی تہذیب، اُن کا تمدن اور اُن کی معاشرت وادی سندھ کے قدیم باشندوں کی تہذیب اور معاشرت سے قطعاً مختلف تھی۔ وادی سندھ کے قدیم باشندوں کا نظام معیشت تو زرعی تھا لیکن اُنہوں نے بڑے بڑے شہر بھی آباد کئے تھے، جہاں تجارت، صنعت و حرفت اور دستکاریوں کو بے انتہا فروغ حاصل تھا۔ آریائی قبائل بڑے بڑے شہروں کی بجائے چھوٹے چھوٹے دیہات میں رہتے تھے اور اُن کی معیشت خالصتاً زرعی تھی۔ ایک گاؤں میں زیادہ تر ایک ہی قبیلے کے لوگ آباد ہوا کرتے تھے۔ قبیلے کے لوگوں کے علاوہ باقی لوگ قدیم باشندوں میں سے ہوا کرتے تھے جن سے وہ غلاموں کی طرح محنت و مشقت کا کام لیتے تھے۔ انہی لوگوں کی اولاد آگے چل کر شودر کہلائی۔ قدیم باشندے عقیدۂ بت پرست تھے۔ اور مختلف دیوی دیوتاؤں کے بت بنا کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ ان دیوی دیوتاؤں میں دھرتی ماما خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آریہ لوگ بھی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن بت پرست نہ تھے۔ جن دیوتاؤں کی پرستش وہ کرتے تھے ان میں اندرا، ویرونا، اتراسوریہ اور اگنی خاص طور پر ممتاز تھے۔ وہ ان دیوی دیوتاؤں کو قدرت کی طاقتوں کے مظاہر سمجھتے تھے، اور مختلف گیت اور بھجن گا کر اُن کی پرستش کرتے تھے۔ ان دیوتاؤں میں سے سوریہ یعنی سورج اور اگنی یعنی آگ کی پرستش قدیم ایران میں بھی کی جاتی تھی۔ اس سے آریاؤں اور قدیم اہل ایران کا قریبی تعلق بدیہی طور پر ثابت ہوتا ہے۔ جب انوروں میں سے ہیل اور گائے قدیم باشندوں کی نگاہ میں بڑی قدر و قیمت رکھتے تھے۔ درانحالیکہ آریاؤں کو گھوڑے سے زیادہ اُنس تھا۔ کیونکہ گھوڑا سواری اور کھیتی باڑی کے علاوہ میدان جنگ میں بھی کار آمد تھا۔ سب سے بڑا فرق دونوں قوموں میں یہ تھا کہ وادی سندھ کے قدیم باشندے

پڑھنا لکھنا جانتے تھے اور اُن کا اپنا ایک رسم الخط بھی تھا جو تصویری رسم الخط سے مشابہت رکھتا ہے لیکن آریہ لوگ فنِ تحریر سے نا آشنا تھے محض تھے۔ وہ عبادت کے گیت اور بھجن زبانی یاد کرتے تھے اور یہ گیت اور بھجن سینہ بہ سینہ منتقل ہوا کرتے تھے۔

آریاؤں کے دور کو زمانے کے قُرب و بُعد کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ پہلے دور کو قدیم آریائی دور کہا جاتا ہے جسے رگ ویدک تہذیب کا دور بھی کہتے ہیں۔ دوسرے دور کو ثانوی ویدک دور کہتے ہیں۔

لیکن ان دونوں زمانوں میں صرف زمانے کے قُرب و بُعد کا فرق نہیں بلکہ علمی، معاشرتی، مجلسی اور اقتصادی اعتبار سے بھی دونوں متباہن اور ایک دوسرے سے جدا نظر آتے ہیں۔ اہتدائی ویدک زمانے میں زندگی کے تمام شعبوں میں سادگی اور بے تکلفی پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں تمام قوم دیہات میں بٹی ہوئی تھی ہر گاؤں میں تقریباً ایک ہی خاندان کے لوگ آباد ہوا کرتے تھے اور خاندان کا سردار تمام سیاسی، مجلسی اور مذہبی امور میں اہل خاندان کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ ہر گاؤں ایک علیحدہ اور تقریباً خود مختار قسم کی وحدت ہوتا تھا۔ اگر کوئی بڑا قبیلہ ایک سے زیادہ دیہات میں آباد ہوتا تھا تو یہ سب دیہات مل کر ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ زندگی کا نظام خالصتاً دیہاتی تھا۔ بڑے بڑے شہروں کا وجود ناپید تھا۔ ان بڑی وحدتوں میں راجاؤں کے علاوہ پروہت بھی ہوا کرتے تھے جو مذہبی معاملات کے علاوہ سیاسی امور میں بھی راجاؤں کے نائب اور مددگار ہوتے تھے۔ ہر ریاست کے راجہ کے پاس ایک باقاعدہ فوج ہوتی تھی جو ریاست کی سرحدوں کی حفاظت بھی کرتی تھی اور اندرون ریاست انتظام کی ذمہ دار بھی ہوتی تھی۔ ہر چند کہ راجہ خود مختار اور مطلق العنان ہوتے تھے۔ لیکن ملکی معاملات میں عوام کی مرضی کو بھی بڑا دخل تھا۔ ہر ریاست میں ایک قسم

کی انتظامی مجلس ہوتی تھی جسے سمتی کہا جاتا تھا۔ ان سمتیوں میں عوام کو پوری پوری نمائندگی حاصل تھی۔ سمتی کے علاوہ سبھا کے نام سے ایک اور تنظیمی ادارہ بھی ہوتا تھا۔ اس ادارے میں مختلف دیہات کے سربراہوں کو شامل ہوا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے سمتی اور سبھا گویا آج کل کے دارالامراہ اور دارلعوام کی طرح تھے۔

مجلسی زندگی کا محور خاندان یا گھرانہ تھا۔ خاندان کے افراد بل جمل کر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور خاندان کا سب سے عمر رسیدہ آدمی اس کا سربراہ ہوا کرتا تھا۔ چونکہ معیشت کا دار و مدار زیادہ تر کاشتکاری پر تھا۔ اس لئے لوگوں کے دلوں میں بیٹیوں کی خواہش زیادہ ہوتی تھی۔ لیکن بیٹیوں کا وجود بھی ناگوار نہ تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج بھی عام تھا۔ شادی بیاہ کی رسمیں دلہن کے گھر سے راجسام پذیر ہوتی تھیں عام طور پر مرد ایک ہی شادی کرتے تھے۔ گھر میں عورت کو مناسب مقام اور احترام حاصل تھا۔ لباس کے معاملے میں یہ لوگ خوش ذوق تھے۔ سونے چاندی کے زیورات پہننے کا شوق عام تھا۔ اور یہ شوق مردوں اور عورتوں میں یکساں تھا۔ خوراک سادہ اور عام طور پر گندم کی روٹی، دودھ اور مچھلوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ لیکن گوشت خوری کا رواج بھی عام تھا۔ بعد میں گوشت خوری سے پرہیز کا رواج جو ہندوؤں میں آج تک چلا جا رہا ہے۔ بدھ مت کے اثر و نفوذ کے باعث ہوا۔ لوگ مردانہ قسم کے کھیلوں، شکار اور جنگجو یا نہ رقص کے شائق تھے۔ عورتوں میں ناچ گانا خاص طور پر بہت مقبول تھا۔ معاشرہ اسی زمانے میں چار ذاتوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ لیکن یہ تقسیم اتنی شدید اور کڑی نہ تھی جتنی بعد کے زمانے میں ہو گئی تھی۔

ہر زرعی نظام میں دستکاروں اور صناعتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ اُس زمانے کے دیہات میں بھی ہر قسم کے دستکار مثلاً ٹیڑھٹی، لوہار، ستار، موچی، جلاہے اور کھار ملتے تھے۔ جو اپنی اپنی دستکاریوں کے ذریعے لوگوں کے لئے مختلف اشیائے ضرورت

مہیا کیا کرتے تھے۔ کاریگروں میں بومبار کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کیونکہ وہ لڑائی کے لئے ضروری ہتھیار بنایا کرتا تھا۔

رگ وید کے زمانے میں مختلف علوم و فنون نے بہت ترقی کی۔ فنون لطیفہ میں شاعری اس دور میں ممت از ترین فن لطیف نظر آتی ہے۔ چنانچہ رگ سمہیتا اس زمانے کی نہایت حسین نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں زیادہ تر دیوی دیوتاؤں کی توصیف و تمجید میں ہیں۔ اُس زمانے میں مختلف مظاہر قدرت کو دیوی دیوتاؤں کا درجہ دیا جاتا تھا مثلاً ”پرخوی“ دھرتی ماما یا زمین کی دیوی تھی۔ ”وارونا“ دیوتا وسیع و عریض اور عظیم آسمان تھا۔ اور اسی دیوتا کی پوجا سب دیوی دیوتاؤں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اندر دیوتا ”بجلی اور بادل کا دیوتا تھا۔ ”سوریہ“ دنیا کو روشن کرنے والا دیوتا اور ”ساوتری“ کائنات کو زندگی عطا کرنے والی دیوی تھی۔ اسی طرح ”اوشا رانی“ صبح کی حسین و جمیل دیوی تھی۔ جس کے حسین و جمال کی تعریف میں رگ سمہیتا میں بہت سے گیت ملتے ہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیانی خلا میں ”اندر“ کے علاوہ دوسرے دیوتا بھی تھے جن میں سے وایو دیوتا (ہوا) اور پربینا دیوتا (بارشیں) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زمینی دیوتاؤں میں سے اگنی دیوتا اور سرسوتی دیوی نمایاں ہیں۔ سرسوتی دیوی ابتداً دریاؤں کی دیوی تھی۔ چنانچہ سرسوتی ایک قدیمی دریا کا نام بھی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس دیوی کو علم و دانش کی دیوی سمجھا جانے لگا۔ زمینی دیوتاؤں میں سے اگنی دیوتا کو سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا۔ اور کوئی یگیہ بھی اُس کے نام کا نذرانہ دیتے بغیر مکمل نہ ہو سکتا تھا۔

اُس زمانے کی صنمیت کا ایک نہایت اہم پہلو یہ بھی ہے کہ دیوتاؤں کو دیویوں سے زیادہ طاقتور اور فعال تصور کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پرخوی، سرسوتی، اوشا اور اس قسم کی دوسری دیویوں کی حیثیت دیوتاؤں کے مقابلے میں کمتر درجے

کی ہے۔

اُس زمانے کی تہذیب کی علاقائی اور جغرافیائی حدود کا تعین ان دریاؤں سے ہوتا ہے۔ جن کا ذکر رگ وید اور اُس زمانے کی دوسری علمی تالیفات میں ملتا ہے۔ ان دریاؤں میں اہم اور نمایاں دریائے گجھا (کابل)، سواستو (سوات)، سندھو (سندھ)، کشو ماں (سولہا)، ویتاستا (جہلم)، اشکنی (چناب)، پرشری (راوی)، وپاس (بیاس)، اور ستوری (ستلج) ہیں۔ ستلج سے پرے دریائے جہا اور گنگا کا ذکر بعد کے دور میں عام لیکن اس دور میں بہت کم ہے۔ ان دریاؤں کے ذکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سطح مرتفع پوٹھوہار کو بھی رگ ویدی تہذیب و تمدن کے مرکزی علاقے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس علاقہ کی مرکزی اہمیت بہت دیر تک قائم رہی۔ البتہ کئی سو سال کے بعد جب آریہ لوگ ہندوستان کے وسطی اور مشرقی علاقوں تک پھیل گئے تو گجھا ولس کی اہمیت بڑھ گئی۔ اُس زمانے میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں جن کی وجہ سے بڑے بڑے شہر بھی عالم وجود میں آئے۔ بڑے بڑے شہروں کے اعتبار سے بھی پوٹھوہار کا علاقہ ملک کے دوسرے حصوں سے کچھ کم نہ رہا۔ چنانچہ جس زمانے میں پاٹلی پتر ہندوستانی راجاؤں کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے شہرت اور عظمت کے بلندیوں پر جا پہنچا۔ اُس زمانے میں ٹیکسلا بھی شان و شوکت کے لحاظ سے کچھ کم نہ تھا۔ ابتدائی ویدک زمانے میں آریاؤں نے اُس علاقے پر قبضہ کیا جو دریائے کابل اور دریائے گنگا کے درمیان واقع ہے۔ اس طرح اُن کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز پوٹھوہار کا علاقہ یا یوں کہیے کہ پاکستان کے نئے دارالحکومت اسلام آباد کے ارد گرد کا علاقہ تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، وسط ایشیا کے علاقوں سے قبائل کی آمد کا سلسلہ متواتر اور مسلسل طور پر جاری رہا۔ اور جیسے جیسے نئے قبائل اس تہذیب میں آتے رہے ان کا دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی باہمی

خانہ جنگیاں جن کا آغاز اُن کے حقیقی وطن میں ہوا تھا، اس بڑے صغیر میں پہنچنے کے بعد بھی جاری رہیں۔ طاقتور قبائل کمزور قبائل پر غالب آتے رہے۔ اور کمزور قبائل یا تو طاقتور قبائل کے اندر جذب ہوتے رہے یا نئے مقامات کی تلاش میں مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے رہے۔ ان مسلسل خانہ جنگیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قبائل کی قوت اور دولت میں ہر اہم اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان قبائل کے نیا جاؤں کی حدود سلطنت بڑھتی چلی گئیں۔ بڑی بڑی حکومتوں کے وجود میں آنے سے اُس زمانے میں بڑے بڑے شہر آباد ہونے لگے۔ اور آریائی تہذیب جو ابتداً ایک دیہی اور زرعی تہذیب تھی۔ شہری تہذیب و تمدن کا روپ اختیار کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ دریائے گنگا کا وسیع و عریض میدان آریائی تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا۔ طاقتور آریائی قبائل کی فتوحات کچھ تو بلند حوصلہ راجاؤں کی خواہشیں اقتدار کی مڑھون منت تھیں اور کچھ اُن کے برہمن پجاری بھی انہیں اُبھارتے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے مذہبی معتقدات کی بناء پر اس امر کے خواہاں تھے کہ اُن کے دیوتاؤں کے اثر و رسوخ کا حلقہ نیا دھرم سے زیادہ وسیع ہو۔ خاص طور پر اگنی دیوتا کے پجاری اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لئے نئے نئے علاقوں میں ہون کنڈ تعمیر کر کے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے خواہشمند تھے۔ فتوحات کا یہ سلسلہ ویدک تہذیب کے ثانوی دور میں مسلسل جاری رہا۔ جتنے کہ اس دور کے اختتام کے قریب آریائی قبائل دریائے گنگا اور جمناسے سیراب ہونے والے تمام زرخیز علاقوں پر قابض ہو چکے تھے۔ بلکہ بعض جرات مند راجاؤں نے وسط ہند کے گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کو عبور کر کے دکن کے علاقے میں بھی اپنے قدم جمائے تھے اور دریائے گوداوری کا شمالی علاقہ بھی اُن کے زیرِ نگیں ہو چکا تھا۔

اس زمانے میں جن آریائی قبائل نے زبردست سیاسی اقتدار حاصل کیا۔ اُن میں کورو، پنجاب اور ودھار قبائل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کورو قبیلے کے لوگ کوشتیر

اور موجودہ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں آباد تھے۔ پنجال جنوب مشرقی اضلاع میں جنہیں آجکل بریلی، بڑالوں اور قریح آباد کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ آباد تھے۔ اُس زمانے کے ویدک ادب میں ہمیں کوروؤں کا تذکرہ بہتات سے ملتا ہے۔ احمرو وید میں جو باقی تین ویدوں کے مقابلے میں بعد کی تالیف ہے، مختلف کورو راجاؤں اور اُن کے کارناموں کی تفصیل ملتی ہے۔ ان کورو راجاؤں میں سے پرتی پرتی، پرکشت اور جنم جایا کے تذکرے رزمیہ داستانوں میں عام ہیں۔ احمرو وید میں ایک نہایت عمدہ گیت راجہ پرکشت کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ اس گیت میں اُسے راجہ ادھیراج کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اور اُس کی سلطنت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نہایت خوش حال علاقہ ہے۔ جس میں سورگ کی طرح دودھ اور شہد کی نہریں جاری ہیں۔ پنجالوں میں بھی بعض بڑے بڑے فتح مند راجا ہو کر گزرے ہیں۔ پنجالوں اور کوروؤں میں باہمی اتحاد پایا جاتا تھا۔

برہمنی تہذیب پنجالوں کے علاقے سے گزر کر مشرق میں کوشل اور کاسی کے علاقوں تک جا پہنچی تھی۔ دریائے گندک کے مشرق کی طرف ودھیا قبیلے کے لوگ آباد تھے اور اُس سے آگے واردہا کے علاقے میں ودھارہ قبیلے کا عمل دخل تھا۔ مذکورہ بالا تمام قبائل کی رگوں میں خالص آریائی خون تھا۔ لیکن ان علاقوں سے اور مشرق کی طرف انکا اور گدھ قبائل آباد تھے۔ جن کی نسلوں میں آمیزش ہو چکی تھی۔ انکا قبیلہ مشرقی بہار پر متصرف تھا اور گدھ قبیلہ جنوبی بہار پر قابض تھا۔ اُس سے اور آگے مشرق اور جنوب کی طرف قدیم ہندوستان کے قبائل مثلاً شمالی بنگال کے پوندرا، ودھیا پل کے علاقوں کے پندے اور دریائے گوداوری کے طاکیس میں آندھرا قبیلے کے لوگ رہتے تھے۔

بادشاہتوں کے قیام کے ساتھ ساتھ لوگوں کے نظریہ حیات میں تبدیلی کا واقع ہونا لازمی اور لا بدی تھا۔ اس زمانے میں آریاؤں میں ذات پات کی گرفت زیادہ مضبوط ہوئی اور اونچی ذات کے لوگوں یعنی برہمنوں اور کھشتریوں کو وہ خاص مراعات حاصل

ہوئیں۔ جن سے نیچی ذاتوں کے لوگ یعنی ویش اور شورو محروم قرار دیئے گئے۔
 کا بدلنا جوابتدائی ویدک زمانے میں کچھ مشکل نہ تھا۔ اس زمانے میں مشکل تو ضرور ہو
 گیا لیکن ابھی تک آئندہ دور کی طرح ناممکن نہ ہوا تھا۔ اس زمانے میں ہندوؤں میں بڑے
 بڑے مذہبی فلاسفر پیدا ہوئے جنہوں نے مذہب کی پرانی اور سادہ صورت کو بدل کر
 اس میں فلسفیانہ پیچیدگیاں اور مفکرانہ نزاکتیں پیدا کیں۔ قدیم دیوتا جو درحقیقت عوامی فطرت
 کے مظاہر تھے۔ اب نئے نئے تخیلی لباسوں میں جلوہ گر نظر آنے لگے۔ انسانی ذہن جو فکر و نظر
 کے نئے نئے بُت تراشنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ اس دور میں نہایت تیزی سے کام کرنے
 لگا۔ اوتاروں کا تصور اسی دور کی پیداوار ہے۔ چنانچہ پر ماتما کو پرو جاتی یعنی تمام
 کائنات کے مالک کا نام دیا گیا۔ جو مختلف اوقات میں مختلف انسانوں میں حلول کر کے دنیا
 پر اتر آتا ہے اور انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اوتار پرستی
 کے اس جذبے کی بدولت رام اور کرشن کو جو رزمیہ داستانوں کے ہیرو تھے جھگوان
 کا درجہ حاصل ہو گیا۔ اور ہندوؤں میں ان کی پرستش رواج پذیر ہو گئی۔ جو آج تک
 جاری ہے۔

اس ثانوی ویدک دور میں آریاؤں کے مذہب میں نہایت اہم اور دُور رس تبدیلیاں
 رونما ہوئیں۔ قدیم دیوی دیوتاؤں کی آب و تاب مہم ہو رہی تھی۔ اور نئے نئے دیوتا ابھر
 رہے تھے۔ اتمرو وید میں بعض قدیم دیوی، دیوتاؤں مثلاً وارونا دیوتا یا پرستھوی دیوی کی
 تعریفیں گیت ملتے ہیں۔ لیکن ان کی ذات میں بھی اب وہ عظمت نہ تھی جو ابتدائی ویدک
 زمانے میں پائی جاتی تھی۔ اس نئے دور میں برہما دیوتا کو عروج حاصل ہوا۔ جسے پر ماتما یا روح
 کل سمجھا جانے لگا۔ یہ پر ماتما یا روح کل تمام کائنات میں جاری و ساری تھی۔ اور
 انسانی قلب و نظر کی رہنمائی کرتی تھی۔ اس کی ذات ازلی، ابدی اور لافانی تھی۔ اس طرح
 ہندو مذہب کے عظیم فلاسفر کثرت پرستی سے وحدت پرستی کی طرف آرہے تھے۔

لیکن عوام کے ذہن چونکہ ان فلسفیانہ باریکیوں کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ اس لئے ہندو معاشرہ توحید کی طرف قدم نہ بڑھا سکا۔ پڑانے رگ وید میں دیوتاؤں کی جگہ اب نئے دیوتا لوگوں کی پرستش کا محور بننے لگے۔ ان دیوتاؤں میں شیو اور وشنو کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ شیو کو مہادیو یعنی بڑا دیوتا اور پاسوپتی یعنی ذی روح مخلوق کا محافظ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی دیوتا کو تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیو لنگ کی پرستش آج تک ہندوؤں کے اساسی مذہبی معتقدات میں شامل ہے۔ وشنو سورج دیوتا کا نیا نام تھا۔ یہ دیوتا چونکہ اس حرارت اور قوت کا سرچشمہ ہے۔ جس سے تمام کائنات کو زندگی اور نشوونما حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے اسے انسانوں بلکہ خود دیوتاؤں کا نجات دہندہ خیال کیا جاتا تھا۔ اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے وشنو دیوتا نے جلد ہی قدیم وارونا دیوتا کی جگہ حاصل کر لی۔ اس دیوتا کا نام واسدیو بھی تھا۔ اور کرشن جی کو جنہیں رزمیہ دور میں بے انتہا عظمت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ اسی دیوتا کا اوتار سمجھا جانے لگا۔ کرشن جگتی نے ایک اور مکتب خیال کو جنم دیا۔ اس مکتب خیال کے پیروؤں کا عقیدہ تھا کہ رسی پوجا پاٹ جو پجاریوں کے ہاں بالعموم مروج تھی روحانی صفائی اور تزکیہ نفس کے لئے اتنی کارآمد نہ تھی جتنی کارآمد جگتی اور عالمگیر انانی محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس مکتب خیال والوں کے ہاں مذہب کی ظاہری رسوم، ہون اور گیہ کو درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی ان کے ہاں برہمن پجاریوں کا وہ مرتبہ تھا جو ان سے پہلے زمانے کے ہنود میں ملتا ہے۔ مذہب کا یہ نیا تصور کرشن جگتی کی اس لہر کا پیش رو تھا جو مابعد کے زمانے میں ہندوؤں میں نہایت جوش و خروش سے ظہور پذیر ہوئی اور آج تک پورے اہتمام سے موجود ہے۔

وہ آریائی قبائل جو اب تار میں دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر گھر

بنا کر آباد ہونے اور بعد ازاں اندرون ملک میں پھیلنے چلے گئے۔ جنگجو اور لڑائی بھڑائی کے بڑے شوقین تھے لیکن اس کے ساتھ ہی گیتوں اور سمجھنوں کے دلدادہ بھی تھے۔ یہ گیت اور بجن دیوتاؤں اور دیویوں کی تعریف میں گائے جاتے تھے۔ تہواروں پر بالعموم اور فوجی کے جشن میں بالخصوص رقص و نغمہ اور رامش و رنگ کی تقریبات برپا کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ فطرت پرست تھے۔ اور مظاہر فطرت کی پرستش کھلے میدانوں اور سبزہ زاروں میں کیا کرتے تھے۔ اس لئے آؤں کے ہاں مندر یا عبادت گاہیں بنانے اور ان عبادت گاہوں میں رسمی پوجا پاٹ کرنے کا رواج نہ تھا۔ بلکہ فطرت کے آزاد منش اور خوش باش بچوں کی طرح اپنے دل کے جذبے اور آئنگ کی بنا پر سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں گایا اور رقص کیا کرتے تھے۔

اُس زمانے میں شعر گوئی کا شوق اور ج کمال پر تھا۔ چنانچہ طریقہ گیتوں کا ایک مجموعہ جس کا نام رک سمہا تھا ہے۔ اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس مجموعے میں ایک ہزار ترہ گیت ہیں۔ جو مختلف دیوی، دیوتاؤں کی شان میں کہے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ مختلف ابواب میں منقسم ہے ہر باب میں آٹھ یا دس گیت ہیں۔ آٹھ گیتوں کے باب کو اشکا اور دس گیتوں کے باب کو منڈل کہا جاتا ہے۔ ان ابواب اور منڈلوں کو ملا کر مجموعے کے مختلف دفتر تیار کئے گئے ہیں ہر دفتر کے گیت علیحدہ علیحدہ رشیوں مینیوں کے ساتھ منسوب کئے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ آریہ لوگ اپنے ابتدائی دور میں مختلف مظاہر فطرت کو ہی دیوی دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے مشہور دیوی، دیوتا، جن کی شان میں مختلف گیت لکھے گئے ہیں۔ سوریا، اندر، اگنی، اوشا، سرسوتی وغیرہ ہیں۔ شیو اور کرشن کے نام بھی ان گیتوں میں آتے ہیں۔ لیکن اس دور کا کرشن دیوتا بعد کے دور کے کرشن دیوتا سے مختلف ہے۔

اسی زمانے میں ویدوں کے اشلوک اور منتر بھی جمع کئے جانے لگے۔ چاروں

دیروں میں قدیم ترین برگ وید ہے۔ جس میں مختلف دیوتاؤں کی تعریف و توصیف میں نہایت عمدہ اور حسین گیت ملتے ہیں لیکن قدیم آریہ لوگ فن تحریر سے نا آشنا تھے۔ اس لئے بھجن اور گیت زبانی یاد کئے جاتے تھے۔ اور سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے جدید محققین کا خیال ہے کہ فن تحریر کہیں چھٹی صدی قبل مسیح میں متروج ہوا اور اس بڑے عظیم میں ایرانیوں کے ہمراہ آیا۔ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کا باہمی میل جول تو قدیم زمانے سے رہا۔ لیکن ہخامنشی خاندان کے عظیم المرتبت شہنشاہ کوروش بزرگ کے زمانے میں ایرانیوں کی فتوحات کا رخ ہندوستان کی طرف پھرا۔ حتیٰ کہ ۵۱۸ ق م میں دارا پورخس اول نے وادی سندھ کو فتح کر کے اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ ایرانیوں کی آمد سے ہندوستان میں خردوشتری رسم الخط وارد ہوا۔ تقریباً اُسی زمانے میں سنسکرت رسم الخط کا بھی وجود میں آیا، محض اتفاقی امر نہ تھا بلکہ اس سے یہ تاریخی حقیقت جو عام طور پر مورخین کی نظروں سے اوجھل رہی ہے۔ واضح ہو جاتی ہے کہ سنسکرت رسم الخط کا منبع اور سرچشمہ خردوشتری رسم الخط ہے۔

ایرانی اور یونانی اثرات کا زمانہ

پچھٹی صدی قبل مسیح کے آغاز میں ایران میں ہخامنشی خاندان کا ایک نہایت عظیم الشان بادشاہ کوروش یا سیروش بزرگ (CYRUS THE GREAT) سریہ آرائے سلطنت ہو کر آیا کی تاریخ میں ہخامنشی خاندان کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس خاندان کے زمانے میں ایرانی سلطنت کی توسیع شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ یہ سلطنت اُس زمانے کی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔ جس کی سرحدیں ایک طرف یونان اور دوسری طرف ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ کوروش اعظم نے بلند حوصلہ اور فتح مند بادشاہ ہو گئے۔ جب مغرب کی طرف وہ اپنی سلطنت کی سرحدات کو بحیرہ روم تک پھیلا چکا تو مشرق کی طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ اس کی افواج ہندوستان کے دروازے پر اکھڑی ہوئیں۔ یہاں اُس نے اپنی افواج کو منظم کر کے ہندوستان پر ایک بہت بڑا حملہ کیا اور کیسیا شہر کو، جو دریائے سندھ کے مغرب میں واقع تھا، تخت و

تاراج کر دیا۔ اور سندھ سے پار تمام علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ کوروش کے بعد اس کے پوتے داریوش اول نے دریائے سندھ کو عبور کر کے تمام وادی سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس زمانے میں یہ علاقہ گندھارا کے نام سے مشہور تھا۔ اور نہایت مسرت، شاداب اور خوشحال تھا۔ اس صوبے کے دو بڑے شہر تھے۔ جو شکاوتی اور ٹیکسلا کے نام سے مشہور عالم تھے۔ یہ دونوں شہر تہذیب و تمدن، علم و فضل، آرٹ اور ادب کے بہت بڑے مراکز تھے۔ گندھارا کا علاقہ ۵۱۸ ق م میں ایرانیوں کے زیرِ نگیں آیا۔ اس فتح پر جہاں ایک طرف ایرانی سلطنت کی سرحدیں توسیع ہوئی۔ وہاں ایران کے شاہی خزانے میں بھی تقریباً دس لاکھ اشرفی سالانہ کا اضافہ ہوا۔ گندھارا کا صوبہ ایرانی سلطنت کا بیسواں صوبہ تھا۔ اور اس سلطنت کے باقی تمام صوبوں سے زیادہ امیر اور دولت مند تھا۔ داریوش اول کے بیٹے کینکسرو کے زمانے میں یہاں غیر ملکی تسلط کے خلاف ایک بہت بڑی شورش برپا ہوئی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کینکسرو نے اس شورش کو سختی سے دبا دیا۔ اس شورش کا ذکر کینکسرو کے زمانے کے کندہ کئے ہوئے بعض نقوش میں ملتا ہے۔ چنانچہ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے۔

”جس سرزمین میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔ وہاں آہورا مزدا کی عنایت سے میں نے اُن کی پرستش گاہوں کو تباہ و برباد کر کے آہورا مزدا کا نام بلند کیا۔“

کینکسرو کے بعد ایرانی شہنشاہ کمزور ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد مشرقی ممالک پر ان کا پنجہ اقتدار کمزور پڑ گیا اور رفتہ رفتہ دریائے سندھ کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔ چنانچہ دریائے کابل اور سوات سے سیراب ہونے والے علاقے میں اسواکوں کی حکومت قائم ہوئی۔ پشکلاوتی اور ٹیکسلا دو علیحدہ ریاستوں کے صدر مقام بن گئے۔ ٹیکسلا کی ریاست کے مشرق میں پور و قبیلہ حکمران

محلہ اس قبیلے کی بھی دو ریاستیں تھیں۔ ایک ریاست دریائے جہلم اور چناب کے درمیانی علاقے میں قائم تھی۔ اور دوسری دریائے چناب اور راوی کے درمیانی علاقے پر مشتمل تھی۔ لہذا میں جب سکندر اعظم نے اس علاقہ پر حملہ کیا تو اس وقت بھی پورے قبیلہ ہی اس علاقے پر حکمران تھا جس کے راجہ کو یونانیوں نے قبیلے کے نام پر راجہ پورس لکھا ہے۔

ان تمام ریاستوں میں ٹیکسلا کی ریاست دولت و ثروت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ممتاز ترین تھی۔ ٹیکسلا اس ریاست کی راجدھانی تھا اور اس زمانے کے نہایت عظیم الشان شہروں میں سے ایک تھا۔ یہ شہر اس بڑی شاہراہ پر واقع تھا جو وسط ایشیا کو اندرون ہند سے ملاتی تھی۔ یہاں ایک عالی شان تجارتی منڈی تھی جس کی شہرت ایران اور یونان تک پھیلی ہوئی تھی۔ تجا سنی منڈی بننے کے علاوہ یہ شہر علم و دانش کا بہت بڑا مرکز تھا۔ یہاں ایک نہایت اعلیٰ درجے کی یونیورسٹی قائم تھی۔ اس یونیورسٹی میں ایران، وسط ایشیا اور چین تک کے طلباء اپنی علمی پیاس بجھانے آتے تھے۔ اس یونیورسٹی میں ویدوں اور آپشدوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پانینی جو سنسکرت زبان کا بہت بڑا عالم اور اس کی گرامر کا مؤسس تھا۔ اسی شہر کا باشندہ تھا۔ تاریخی روایات کے مطابق ہندوؤں کی عظیم رزمیہ نظم مہا بھارت سب سے پہلے اسی شہر میں پڑھی گئی۔

ٹیکسلا شہر کی ابتدائی تاریخ کے متعلق ہمیں جو کچھ معلوم ہے، وہ محض قیاسات پر مبنی ہے۔ حتمی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شہر کس زمانے میں آباد ہوا۔ اور اس کا بانی کون تھا؛ لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ اس شہر کو ٹکٹا نامی ایک قبیلے نے جو وسط ایشیا سے ہندوستان میں وارد ہوا تھا۔ آباد کیا تھا۔ چنانچہ اسی قبیلے کے نام پر پہلے پہل اس کا نام "ٹکاشیلا" پڑا جو رفتہ رفتہ ٹیکسلا بن گیا۔ اس قیاس کی تصدیق مشہور ہم عصر مؤرخ پلوٹارک کی

تھریوں سے بھی ہوتی ہے۔ جس نے اسے ٹیکسٹون کا شہر لکھا ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی باہمی چشمک اور آدینہ شہ نے غیر ملکی حملہ آوروں کے لئے ہندوستان کا دروازہ کھول دیا۔ چوتھی صدی قبل مسیح کے آغاز میں ایران کی عظیم الشان سلطنت میں کمزوری کے آثار پیدا ہونے لگے۔ اسی زمانے میں یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کی عنان حکومت ایک عالی ہمت اور بلند جوصلہ فرماں روا سکندر ابن فیلقوس نے سنبھالی۔ مقدونیہ کی ریاست شاہ ایران کی باج گزار تھی۔ سکندر نے خراج دینا بند کر دیا۔ جس پر ایران کے شہنشاہ دارا گشتاسپ اور اس کے درمیان دو بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ دوسری بڑی لڑائی میں جو ۳۳۱ ق م میں ہوئی۔ دارا گشتاسپ کو شکست ہوئی اور ہخامنشی خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔ ۳۳۰ ق م میں دارا گشتاسپ مر گیا۔ اور ایران کی وسیع و عریض سلطنت پر یونانیوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ ایران میں مضبوطی سے اپنے قدم جمانے کے بعد سکندر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ ہخامنشی سلطنت کے تمام علاقوں کا قانونی طور پر مالک ہے۔ چنانچہ اس خیال سے اس نے اپنی فتوحات کا رخ ہندوستان کی طرف موڑا۔

اسی زمانے میں اتفاق سے سکندر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کا ایک اچھا موقع اور بہانہ بھی ملتا تھا آگیا۔ ٹیکسلا کا راجہ امبھی اور گجرات کا راجہ پورس ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ امبھی نے اپنے حریف کو نیا دکھانے کے لئے سکندر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور جب یونانی فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے ریاست ٹیکسلا کی حدود میں پہنچی تو ان کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا۔ امبھی نے یونانیوں کو رُسد اور ملک کی تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اور یونانی فوج مار دھاڑ کرتی ہوئی دریائے جہلم کے کنارے جیسے یونانی ہڈیاں سپس اور قدیم ہندو و تاستا کہتے تھے، سکندر اور پورس کے درمیان معرکہ الہا جنگ ہوئی۔ یونانی فنون جنگ

میں ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ ماہر تھے۔ اُن کے تیز اور سبک رفتار گھڑ سوار دستوں نے جب اچانک پچھلی طرف سے حملہ کیا۔ تو پورس کی فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ اور ہاتھیوں نے جھگڑے میں اپنی ہی فوج کو روند ڈالا۔ یورپ کی طرف سے یہ پہلا حملہ تھا جو سرزمین ہندوستان پر کیا گیا۔

ہندوستان میں سکندر کا قیام بہت مختصر رہا۔ اس لئے اس حملے سے کسی قسم کے فوری نتائج برآمد نہ ہوئے تھے کہ اس زمانے کے ہندی مصنفین نے سکندر کے حملے کو اتنی اہمیت بھی نہ دی کہ اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کر دیتے۔ لیکن سکندر کے چلے جانے کے بعد ہیست سے یونانی یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان میں سے اکثر یونانیوں نے موریہ خاندان کے بادشاہوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ البتہ دریائے سندھ کے مغرب میں سکندر کے حملے کے بعد بھی ایک عرصے تک یونانیوں کی حکومت قائم رہی۔ اس لئے دریائے سندھ کے اس طرف بسنے والے یونانیوں کا ربط اپنی قوم کے لوگوں سے بخوبی رہا۔ موریہ خاندان کے زوال کے بعد انڈو باخترین حکمران صفحہ تاریخ پر نمودار ہوئے۔ ان بادشاہوں میں سے ڈیمیٹریس اور سینڈر خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان یونانیوں نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن، ثقافت، علم و ادب اور مذہب پر گہرا اثر ڈالا۔ اور خود یونانی بھی ہندوستان کے علو و فنون سے بہت متاثر ہوئے۔

ایرانی اور یونانی فتوحات کے اثرات اور نتائج بڑے گہرے اور دور رس تھے۔ ایرانیوں کا اقتدار تقریباً دو سو سال قائم رہا۔ لیکن یہ اقتدار براہ راست نہ تھا۔ مقامی راجے شاہ ایران کو سالانہ خراج ادا کرتے تھے۔ اور رسمی طور پر شہنشاہ ایران کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ تاہم ایرانی اقتدار نے اہل مغرب کے لئے بڑے صغیر پاک و ہند کا دروازہ کھول دیا۔ اور تاریخ میں غالباً پہلی بار ہندوستان اور بحیرہ روم کے ممالک کا باہمی رابطہ قائم ہوا۔ موجودہ پنجاب اور پوٹھوہار کے لوگ اس زمانے میں بھی بڑے جنگجو

اور لڑاکے سپاہی تھے۔ چنانچہ اس علاقے کے بے شمار سپاہی ایرانی فوجوں میں بھرتی ہو کر مختلف ممالک میں جا جا کر فتح آزمائی کرنے لگے۔ یہ سپاہی اول درجے کے نیرہ باز اور تیر انداز تھے اور میدان جنگ میں بڑی بے چگری سے لڑتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خائنشی خاندان کے بادشاہوں کے جھنڈے کے نیچے بارہائیونان اور بحیرہ روم کے دوسرے ممالک میں وادشجاعت دی۔ ایرانی بادشاہوں کی افواج میں ہندوستانی سپاہیوں کے مستقل دستے ہوا کرتے تھے۔

انہی سپاہیوں کی زبان یونان کے علاقوں میں برصغیر ہندوپاک کی دولت اور ثروت کے چرچے ہونے لگے۔ اور اہل یونان کو معلوم ہوا کہ ایران سے پرے ایک ایسا ملک بھی ہے جس کے دریاؤں سے بیش بہا موقی نکلتے ہیں اور جس کی مٹی سونا اگلتی ہے۔ یہی افسانے سن سن کر اُن لوگوں کے دلوں میں بھی ہندوستان پہنچنے کا خیال اور اس سونے کی چڑیا کو اپنے جال میں پھانسنے کا اشتیاق پیدا ہونے لگا۔ اگر اس زمانے میں ہندوستان کی روایتی دولت کے افسانے اہل یونان تک نہ پہنچتے تو شاید سکندر کے دل میں کووہندوکش سے اس طرف آنے کا خیال پیدا نہ ہوتا۔

انڈو باخترین بادشاہوں کے زمانے میں تمام ہندوستان میں بالعموم اور پوٹھوہار اور پنجاب میں بالخصوص یونانی اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ اور اہل ہندوستان کے ہر شعبے میں اہل یونان کے خیالات اور اعتقادات سے متاثر ہونے لگے۔ یونانی حکومتوں کے سفیر ہندوستانی راجاؤں کے درباروں میں پہنچنے لگے۔ ہندوستانی فلاسفر ایٹھنر کی علمی مجلسوں میں، اور ہندوستانی تاجر سکندریہ کی منڈیوں میں دکھائی دینے لگے۔ اشوک نے اپنے عہد حکومت میں اپنے ایک صوبے کی عملداری ایک یونانی گورنر کو سونپی ہوئی تھی۔ اس یونانی گورنر نے اپنے صوبے میں ذرائع آب رسانی کی مہم کا آغاز کیا اور نہریں کھدوا کر زمینوں کو سیراب کیا۔ موریہ خاندان کے زوال کے بعد کشان بادشاہوں

تھے عہد میں بھی یونانی انجینئر اور کاریگر شاہی ملازمت میں منسلک نظر آتے ہیں۔ اہل ہند کی سنگ سازی، اصنام تراشی، ادب اور ڈرامے پر یونانیوں کا گہرا اثر نمایاں ہے بلکہ ہندوستان میں شیچ اور ڈرامے کا آغاز ہی یونانیوں کی ہمت ہوا۔ کرلیوٹون، جو اس زمانے کا مشہور و معروف یونانی خطیب گزرا ہے۔ بیان کرتا ہے کہ ہندوستان کے لوگ ہومر کی رزمیہ نظموں سے نہ صرف آشنا تھے، بلکہ ان کی محفلوں میں ہومر کی نظموں کے بند ڈرامائی انداز میں پڑھے جاتے تھے۔ اور لوگ انہیں سن سن کر محفوظ ہوتے تھے۔ اُس زمانے کے ہندوستانی مصنف اور ادیب مختلف علوم و فنون اور خاص طور پر علم طب میں یونانیوں کے کمال فن کے معترف تھے بلکہ ایک مہمصر ہندوستانی مصنف تو یہاں تک لکھتا ہے کہ اہل ہند یونانی فلسفیوں اور دانشوروں کو ایسی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جیسے وہ اپنے ہاں کے رشیوں مہنوں اور خدا رسیدہ بزرگوں کو دیکھتے ہیں۔

ہندوستانیوں اور یونانیوں کے اس باہمی میل جول کے بہترین اور خوشگوار ترین نتائج ہیں آرٹ اور سنگتراشی کے میدان میں نظر آتے ہیں۔ فن مجسمہ سازی میں گندھارا سکول آف آرٹ اسی باہمی میل جول کا نتیجہ ہے۔ یونانیوں کی آمد سے پہلے اس ملک میں سنگتراشی اور اصنام سازی کا فن ترقی کے نہایت ابتدائی مراحل میں تھا۔ لیکن اس فن میں اُس دور کے یونانی اوج کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہی کی تربیت اور راہ نمائی کے ذریعے ہندوستان کے صنم تراش بھی فن کی انتہائی بلندیوں پر جا پہنچے ٹیکسلا کے کھنڈرات سے مہاتما بدھ کے جو خوبصورت مجسمے برآمد ہوئے ہیں۔ وہ فن مجسمہ سازی کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں بت تراشی کا رواج یونانیوں کی آمد سے پہلے بھی موجود تھا۔ لیکن یہ امر عین قرین قیاس ہے کہ بدھ مت کے پیروؤں میں صنم پرستی یونانیوں کے اثر کی بدولت رائج ہوئی ہو۔ بدھوں میں مہاتما بدھ کے مجسمے کی پرستش مہایان فرقے نے شروع کی۔ جو

انڈو باخترین شاہزادوں کے زمانہ اشر میں وجود میں آیا تھا۔
 علاوہ بریں مہاتما بُدھ کے جو مجھے اُس دور کی یادگار ہیں اُن میں آرٹ کی صفائی
 کے علاوہ اس عظیم مذہبی راہنما کے خط و خال پر بھی یونانی ذہن کا اثر نہایت نمایاں نظر
 آتا ہے۔

موریہ خاندان اور بعد کا زمانہ

پوٹھوہار کے علاقے سے موریہ خاندان کے زمانے کا تعلق نہایت خصوصی ہے کیونکہ اس خاندان کے عروج کا آغاز اس علاقے سے ہوا اور اگرچہ اس خاندان کے بائیس پندرہ گیت موریہ نے بعد میں مگدھ کی حکومت کا خاتمہ کر کے پائلی پٹر کو اپنا دار الحکومت بنالیا تھا۔ تاہم اس کی اور اس کے بعد اس کے جانشینوں کی دلچسپی اس خطہ ملک سے کسی وقت بھی ختم نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ جس کا صدر مقام بدستور ٹیکسلا تھا۔ اس خاندان کے عہد حکومت کے دوران ہر اعتبار سے مسلسل اور متواتر ترقی کے میدان میں آگے بڑھتا رہا۔

یہ زمانہ ہندوستانی تہذیب و تمدن، فکر و فلسفہ اور مذہب و ثقافت میں بڑی دور رس تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ ان تبدیلیوں کا بڑا سبب وہ خارجی اور داخلی اثرات تھے جو اس عہد میں رونما ہوتے رہے۔ داخلی اثرات کے سلسلے میں نمایاں ترین اثر برہمنوں کے فلسفہ مذہب اور اس فلسفہ مذہب کے رد عمل پر بدھ مت کی تعلیمات تھیں۔ قدیم برہمنی مذہب جو کئی سو سال تک ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کا مذہب رہا۔ اپنی قدامت پسندی اور غیر مساویانہ سوشل نظام کی وجہ سے

عالم میں غیر مقبول ہو رہا تھا۔ اور گوتم بدھ کی سادہ، عام فہم اور مساوات انسانی پر مبنی تعلیمات انسانی ذہنوں کو مستحکم کر رہی تھیں۔ خارجیہ اثرات کا ریلہ جو ایرانیوں کے دور اقتدار میں آیا تھا، یونانیوں کی آمد سے اور بھی قوی ہو رہا تھا۔ جیسا کہ ہم پچھلے باب میں بیان کر چکے ہیں۔ یونانی فنون لطیفہ، ثقافت اور کسی حد تک یونان کی مذہبی روایات آہستہ آہستہ ہندوستان کی سرزمین میں بڑ پکڑ رہی تھیں۔ گندھارا سکول آف آرٹ روز بروز ترقی پذیر ہوتا تھا۔ اور اس زمانے میں اس کی بہت زیادہ نشوونما ہوئی۔

ویدک تہذیب کے زمانے میں دیوی دیوتاؤں کا وجود مسلم تھا لیکن یہ مجبوری مرقی یا محسوسات کے پیکر نہ تھے۔ انہیں پر ماتما کی طاقتوں کے مظاہر ہونے کی وجہ سے قابل پرستش سمجھا جاتا تھا اور ان کی پرستش کا سیدھا سادا طریقہ بھی یہی تھا۔ کہ ان کی تعریف و توصیف میں گیت اور بھجن گائے جائیں۔ اگرچہ کہیں کہیں بعض دیوی دیوتاؤں کے بتوں کی پرستش بھی ہوتی تھی لیکن بت تراشی اور اصنام سازی کو مذہب کا جز و غالب نہ سمجھا جاتا تھا۔ موریہ خاندان کے زمانے میں پتھر، مٹی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے دیوی دیوتاؤں کے بت بنانے کی رسم عام ہو گئی۔ اور بت تراشی مذہب کا بنیادی جز و قرار پا گئی۔ چنانچہ بت گری اور بت تراشی نے ایک اچھی خاصی مذہبی اور مقدس قسم کی صنعت گری کی صورت اختیار کر لی۔

اس زمانے میں ویدک زمانے کے دیوتاؤں کی پرستش بالکل متروک تو نہ ہوئی لیکن ان دیوتاؤں کے پہلو بہ پہلو نئے نئے دیوتاؤں کو فروغ حاصل ہونا شروع ہوا۔ مثلاً اس سے پہلے سرنوق کو دریاؤں کی دیوی مانا جاتا تھا۔ لیکن کسی خاص ندی یا دریا کی پرستش نہ کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں دریائے گنگا کو ایک دیوی کا درجہ دے کر اس کی پرستش شروع کر دی گئی۔ یونانی خیالات کے اثر و نفوذ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کئی یونانی دیوتائے ناموں کے ساتھ اہل ہند کے معبودوں میں شامل ہو گئے۔ مثلاً زیوس اور

جو غالباً پُرانے دیوتا اندرا کی اور ہر لیکز جو متھرا کے دیوتا واسد کی فنی صورت تھی۔ اسی طرح قدیم بابلی اور ایرانی دیوتا مثلاً ناناہ، متھرا یا مہرا یعنی سورج، ماؤ یعنی چاند اور فارو یعنی آگ کی پرستش بھی ہونے لگی۔ پتھلی بیان کرتا ہے کہ موریائوں کے زمانے میں بڑے بڑے دیوتاؤں مثلاً شیو، سکندا اور وسا کھل کے بتوں کی نمائش اور فروخت شاہی سرپرستی میں ہوا کرتی تھی۔ سکندا اور وسا کھا گنشان بادشاہوں کے زمانے تک بہت مقبول رہے۔ کیونکہ ہوشک کے سکوں پر ان کی تصویریں ملتی ہیں۔ البتہ گنشان بادشاہوں کے بعد ان کی مقبولیت روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔

اس زمانے میں بدھ مت کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی جس کی وجہ سے اسے تمام ہندوستان میں عدیم المثال فروغ حاصل ہوا۔ اشوک نے بدھ مت اختیار کر کے اس کی نشر و اشاعت کے لئے جو کوششیں کیں۔ ان سے تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی بخوبی واقف ہے۔ اشوک نے اپنی مہلخانہ جدوجہد سے اس برصغیر کے رہنے والوں کا مزاج ہی کچھ ایسا بدل ڈالا کہ اس کے بعد صدیوں تک اہل ہند بدھ مت کے ہوا کسی دوسرے مذہب کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوئے تھے کہ جب ہندوؤں کے بڑے بڑے ریفارمرز نے از میر نو ہندو مت کا احیاء کرنے کی کوششیں کیں۔ تو انہیں اپنی ان کوششوں میں اس وقت تک کامیابی حاصل نہ ہوئی جب تک کہ انہوں نے مہاتما بدھ کو اپنے دیوتاؤں اور بدھ مت کے بڑے بڑے اصولوں کو اپنے مذہبی اصولوں میں شامل نہ کر لیا۔ اشوک کے بعد یونانی نسل کا بادشاہ میننڈر اور گنشان خاندان کا فرماں روا کنشک بھی بدھ مت کے سرگرم پیرو تھے۔ چنانچہ ان کی بدولت بھی بدھ مت کو فروغ حاصل ہوا۔

اس شاہی سرپرستی کی وجہ سے بدھ مت کو بہت جلد ایک ملک گیر حیثیت ملنے کے ساتھ ساتھ اس کے قدیم سادہ اصولوں میں بھی تحریف ہوتی چلی گئی تھی کہ یہ مذہب جو

برہمن ازم کی کڑی رسوم و قیود کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ خود برہمن ازم کی برائیوں کا شکار ہو گیا۔ بت پرستی جس کا ابتداء اس مذہب میں نام و نشان تک نہ تھا۔ ایک جڑ و کبیر کی حیثیت سے اس میں داخل ہو گئی۔ سچائی کے بنیادی اصولوں اور اشت مارگ کی تعلیم دینے والا مہاتما بدھ اب خود ایک دیوتا بلکہ دیوتا دیو یعنی دیوتاؤں کا دیوتا بنادیا گیا۔ اور دیوتاؤں کی تمام صفات اس سے منسوب کر دی گئیں۔ اُس کے متعلق یہ عقیدہ فروغ پا گیا کہ ہندوؤں کے مشہور و معروف دیوتا وشنو بھگوان کی طرح وہ بھی بار بار انسان کا روپ دھار کر اس دنیا میں آتا ہے تاکہ اپنی مخلوق کے دکھ درد دور کر سکے۔ برہمنوں کے دیوتاؤں کی طرح اُس کی مورتیاں بننے لگیں اور ان مورتیوں کی پوجا گھر گھر ہونے لگی۔ بدھ مت کی یہ نئی صورت مہایان ازم کہلاتی ہے۔ کنشک خود مہایانی فرقے میں سے تھا اور اس کی سرپرستی میں اس فرقے کو بے انتہا فروغ حاصل ہوا۔ حتیٰ کہ اس کا حریف ہنیانی فرقہ جو اب تک مہاتما بدھ کے بنیادی اصولوں اور اشت مارگ کا علمبردار چلا آتا تھا۔ کم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گیا۔ اُس زمانے میں ہندوؤں میں بھگتی مت اور وشنومت کو فروغ حاصل ہوا۔ بھگتی مت کے پیرو مشہور و معروف ہندو فلسفی سری کرشن کو خدا کا اوتار مانتے تھے اور ہندوؤں میں اس کی مورتیوں کی پوجا کرتے تھے۔ وشنومت بھی بھگتی مت کے قریب قریب تھا اور اس میں بھگتی مت کی تقریباً تمام صفات پائی جاتی تھیں۔ وشنومت کو بدھ مت سے بھی قربت تھی۔ کیونکہ اس مت کے پیرو بھی بدھوں کی طرح گوشت خوری اور جانوروں کو اپنا پہنچانے سے پرہیز کرتے تھے۔ وشنو دیوتا کا حریف شیو دیوتا بھی مقبول ہوا۔ اور شیو کے پجاریوں کو بھی بعض بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ تاہم رفتہ رفتہ بھگتی مت اور وشنومت کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج کے دور میں ہم ہندومت کی جو صورت دیکھتے ہیں وہ درحقیقت وشنومت ہی کی

ایک ارتقائی صورت ہے۔

اسی زمانے میں ہندو سوسائٹی میں یون اور آشرم یعنی ذات پات اور زندگی کے مختلف ادوار کی تقسیم کے اصول جڑ پکڑ گئے۔ یونانی مصنفین جو موریادوں کے زمانے میں ہندوستان آتے رہے، لکھتے ہیں کہ کسی شخص کو اپنی ذات پات سے باہر شادی کرنے یا اپنے آبائی پیشے کے علاوہ کوئی دوسرا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مثلاً ایک کھشتری سپاہی تجارت، کاشتکاری، دستکاری یا درس و تدریس کے مشاغل اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ ذات پات کے قوانین نہایت سختی سے رائج تھے۔ اور غیر ملکی اثرات بھی سوسائٹی کے اس نظام میں کسی قسم کی لچک پیدا نہ کر سکے۔ فلسفی اور دانشور عام طور پر شہری زندگی تیاگ کر بن باس اختیار کر لیتے تھے۔ اور جنگلوں اور غاروں میں بیٹھ کر تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف کا کام کیا کرتے تھے۔ عورتوں کی تعلیم جو قدیم آریاؤں کے زمانے میں عام تھی اس زمانے میں کم ہوتی چلی گئی اور سوسائٹی میں بھی اُن کو وہ مقام اور مرتبہ حاصل نہ رہا جو پہلے ہوا کرتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ متوسمرقی کی تعلیم تھی جس کی رو سے عورتوں کا احترام ایک حد تک جائز تھا لیکن انہیں آزادی عمل نہ دی جاسکتی تھی۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج تھا۔ اور بادشاہوں اور حکمرانوں کے ہاں تو کئی کئی بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ عورتوں کے خرید و فروخت کا رواج بھی تھا۔

ایمانیوں کی آمد کے زمانے سے اہل ہند اور اہل یورپ میں جو باہمی رابطے قائم ہوئے تھے وہ اس زمانے میں اور بھی مضبوط ہو گئے۔ چندر گپت موریاد اور اس کے جانشین بڑے طاقتور اور مضبوط بادشاہ تھے۔ اس لئے اس زمانے میں ملک کی اندرونی اور بیرونی تجارت بڑے زوروں پر تھی۔ خشکی کا قدیم راستہ جو ایران اور عراق سے گزر کر مصر اور یونان تک پہنچتا تھا۔ اب بھی ایک بڑی تجارتی

شاہراہ کے طور پر مستعمل تھا۔ اس کے علاوہ لوگ بحری کشتیوں میں بھی سامان تجارت لا کر ایران کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ ہوتے ہوئے عراق عرب تک پہنچ جاتے تھے۔ دوسرے ممالک کے سیاح اور تاجر بھی یہاں بکثرت آتے ہوں گے۔ جس کا بدیہی ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ چندر گپت موریہ نے اپنے عہد حکومت میں شہروں کے انتظامات اور دیکھ بھال کے لئے جو مختلف کمیٹیاں بنائی ہوئی تھیں ان میں سے ایک کمیٹی غیر ملکیوں کی دیکھ بھال کے لئے بھی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانے کے ملکی اور غیر ملکی ادیب بھی ہندوستان میں آنے والے سیاحوں کا بکثرت ذکر کرتے ہیں۔

موریہ خاندان کے بادشاہ بہت بڑے فاتح اور فرماں روا ہی نہ تھے۔ بلکہ علم و ادب کے میدان میں بھی ان کی فتوحات قابل ذکر ہیں۔ چندر گپت کا نہایت قابل اور مدبر بہن وزیر چانکیہ المعروف کوٹلیہ صاحب تدبیر و زیر ہی نہ تھا بلکہ بہت بڑا صاحب قلم بھی گزرا ہے۔ موریہ خاندان کی حکومت کا قیام چندر گپت کی سپاہیانہ صلاحیتوں کے علاوہ بہت کچھ چانکیہ کی سیاسی بصیرت کا مرہون منت تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ چندر گپت مگدھ دیش کے شاہی خاندان کا ایک معتبوب شاہزادہ تھا۔ اور چانکیہ میکسلا کارہنے والا ایک معمولی برہمن۔ لیکن حالات نے ان دونوں طالع آراؤں کو آپس میں ملا دیا۔ اور ان کے باہمی ملاپ سے پاٹلی پتر سے لے کر باختر تک کے تمام علاقے میں ایک نہایت مضبوط اور پُر شکوہ حکومت قائم ہو گئی۔ یہ حکومت ہندوستان کی تاریخ میں پہلی حکومت تھی۔ جسے ہم شہنشاہیت کا نام دے سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان کی تاریخی روایات کے مطابق رام چندر جی کے عہد حکومت کو ہندوستان کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد کوروؤں اور پانڈوؤں کے ہندوستان کی تاریخ کے بڑے ہیرو سمجھا جاتا ہے لیکن اس تمام عظمت

اور شان و شوکت کے باوجود جو ان قدیم راجاؤں کے ناموں سے وابستہ ہے۔
 رام چندرجی کی حکومت صرف اجودھیا کے علاقے میں اور کوروؤں اور پانڈوؤں
 کی حکومت دہلی اور اُس کے گرد و نواح کے علاقے تک محدود تھی۔ ہندوستان کی
 تاریخ میں شہنشاہیت کا قیام سب سے پہلے موریہ خاندان کے بادشاہوں کے
 دم قدم سے ہوا۔

چانکیہ کے علاوہ موریہ خاندان کے زمانے میں کئی اور نامور اہل قلم بھی گزرے
 ہیں۔ چنانچہ کلیا سوترا جو بھارامہائی کی تصنیف ہے اور کتھا و مٹھو جو بدھ مت کی تعلیمات
 پر مبنی ہے۔ اُسی زمانے کی لکھی ہوئی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے
 کہ ہندو مت کی مشہور و معروف کتاب منوجی کا دھرم شاستر بھی اُسی زمانے
 میں لکھی گئی تھی۔ لیکن یہ خیال چنداں قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ دھرم شاستر حقیقتاً
 ویدک زمانے کے آخری دور کی تصنیف ہے اور ہندو مت کی مختلف فلسفیانہ کتابوں
 کے مجموعے ہی عرصہ بعد لکھی گئی ہے۔

موریہ خاندان کے بعد ملک میں پھر طوائف الملوکی پھیل گئی۔ اور ملک حسب سابق
 چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم ہو گیا۔ لیکن علم و ادب کی جوت بدستور ملک میں
 روشنی پھیلاتی رہی۔ چنانچہ موریہوں کے زمانے کے فوراً بعد تینجلی نے اپنی مشہور
 و معروف کتاب مہا بھاشا لکھی۔ مہا بھاشا ایک خاص علمی اور ادبی کارنامہ ہے۔ کیونکہ اس
 کتاب میں مصنف نے سنسکرت زبان کے مشہور و معروف عالم پانینی کی لکھی،
 ہوئی قواعد کی توضیح و تشریح کی ہے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ
 ہوگا کہ پانینی بھی ٹیکسلا کا رہنے والا تھا۔ اور اسی شخص نے سنسکرت زبان کی گرامر
 کی تدوین کر کے اس زبان کو صحیح معنوں میں علمی مرتبہ عطا کیا۔ ایک اور مشہور و
 معروف کتاب جو موریہ خاندان کے بعد کے زمانے میں لکھی گئی تھی کا تعلق

تھی۔ اس کتاب کا مصنف سروا رام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کتاب ست واہن خاندان کے راجاؤں کی سرپرستی میں لکھی گئی۔ ست واہن خاندان کا ایک راجہ بالآ خود بھی صاحب تصنیف ہوگزارا ہے۔ چنانچہ ”گاتھاسپتاستی“ نامی کتاب اسی کی تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ کشان خاندان کے راجاؤں کے زمانے میں ایک عظیم ادبی شخصیت جس کا نام اسواگھوش تھا۔ عالم وجود میں آیا۔ یہ شخص شاعر، ڈرامہ نگار اور فلسفی تھی۔ اُس نے بھوجپتیا نامی کتاب تصنیف کی جسے ادبیات میں نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ اُس زمانے کی دیگر ادبی شخصیتیں چوک، شسترا، ناگر، جوناکمارتا اور آریہ دیو ہیں۔

ویدک زمانے میں وادی سندھ کی علمی زبان سنسکرت تھی لیکن جب مہاتما بدھ نے ایک نئے مذہب اور نئے معاشرے کی بنیاد رکھی تو اُس نے اپنے خیالات اور تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کے لئے پالی زبان کو اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ پالی زبان ہی وہ زبان تھی جسے عوام بولتے اور سمجھتے تھے۔ چنانچہ بدھ مت کے متعلق کتابیں عام طور پر اسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ موریہ خاندان کے زمانے میں بھی یہی پالی یا پراکرت زبان عوام میں مروج اور مقبول تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی ادب کی تخلیق زیادہ تر اسی زبان میں ہوئی۔ تاہم سنسکرت جسے دیوتاؤں کی زبان سمجھا اور کہا جاتا تھا بالکل نیست و نابود نہ ہو سکی۔ بدھ مت کے فروغ کے ساتھ یہ زبان دب تو ضرور گئی لیکن وہ لوگ جو ہندو مت کے پیرو تھے۔ بدستور سنسکرت کے دلدادہ رہے۔ چنانچہ یہ لوگ اس زبان کو نہایت ذوق و شوق، محنت اور محبت سے سیکھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ویدک ادب بدھ مت زندہ رہا۔ جب بدھ مت کا زوال شروع ہوا تو ہندوؤں کی سنسکرت دوستی اور اُسے سیکھنے کے ذوق و شوق میں اور بھی اضافہ ہوا۔ جتنے کہ گپت خاندان کے زمانے میں سنسکرت نے ایک بار پھر درباری زبان کا درجہ حاصل کیا اور اس زبان میں

علم و ادب کا بڑے دور شور سے چرچا ہونے لگا۔

گپت خاندان کا زمانہ ہندو مت کے احیاء کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں کی تاریخی کتابوں میں اسے ہندوستان کا سنہری زمانہ کہا گیا ہے۔ اس زمانے میں شوازم اور وشنوازم پہلو بہ پہلو ترقی پذیر رہے۔ بدھ مت کا زوال شروع ہوا تو بڑے بڑے ہندو عالموں اور فلاسفروں نے اپنے مذہب میں اصلاح و ترمیم کر کے اسے عوام کے لئے قابل قبول بنا دیا۔ لیکن گپت خاندان کی حکومت زیادہ تر ہندوستان کے وسطی اور مشرقی علاقوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کا سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی اثر و نفوذ بھی انہی علاقوں میں زیادہ تھا۔ انہی علاقوں میں نئے نئے شہر اور بڑے بڑے تہذیبی مراکز قائم ہونے لگے۔ اگرچہ ٹیکسلا اس دور میں علم و ادب کا بہت بڑا مرکز رہا لیکن شاہی سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی قدیم عظمت اور اہمیت روز بروز زوال پذیر تھی۔ گپت خاندان کے بعض راجہ بھی بدھ مت کے پیرو تھے۔ لیکن فی الحقیقت اب اس مذہب کا دور ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے دو چار راجاؤں کی سرپرستی بھی زلزلے کی گمزدش کا رخ نہ پھیر سکی۔ گپت خاندان کے بعد سفید ہنوں کی آمد نے ہندوستان کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی نظام کو بالکل پاش پاش کر دیا۔ ہن قوم تہذیب و تمدن کی دشمن تھی۔ اس لئے شمال مغربی ہندوستان کے وہ علاقے جو قدیم زمانے سے لے کر تہذیب و تمدن کے مراکز چلے آتے تھے۔ یکسر تباہ و برباد ہو گئے۔ ظلم و ستم کی اس آمد بھی میں ٹیکسلا کا چراغ ایسا بجھا کہ پھر کبھی نہ جل سکا۔ توربان اور مہرگی، جن کا نام ہندوستان کی تاریخ میں بکثرت آتا ہے، وحشی اور خونخوار حکمران تھے۔ ان کا دور تشدد پسندی اور دہشت کا دور تھا۔ ان ظالموں کی حکومت کشمیر اور پوٹھوہار کے علاقے میں قائم تھی۔ مہرگی نے پنجاب سے مشرق کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اسے وسط ہند کے ایک راجہ لیشودھران نے شکست دی۔ اس کا فائدہ

لنگل کے میدان اور مشرقی پنجاب میں بسنے والے لوگوں کو پہنچا۔ جہاں تک وادی سندھ کے بالائی حصے اور کشمیر کا تعلق ہے، انہوں نے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ہنوں کے خاتمے کے بعد وردھن خاندان برسرِ اقتدار آیا۔ اس خاندان کا دور حکومت مختصر تھا۔ لیکن اس مختصر سے دور میں ہندوستان میں ایک بار پھر امن و امان بجال ہوا اور لوگ خوشحالی اور فائزخ البالی سے زندگی بسر کرنے لگے۔ تاہم اس دور میں شمال مغربی علاقوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ وردھن خاندان کے بادشاہوں کی حکومت بھی زیادہ تر وسطی ہندوستان کے علاقوں تک محدود رہی۔ پوٹھوہار کا علاقہ ہنوں کی غارتگری کے بعد سنبھل نہ سکا۔ یہاں کی بیشتر آبادی یا تو انہی وحشیوں کے ہاتھوں تہ تیغ ہو چکی تھی یا بھاگ کر وسط ہند کے علاقوں میں جا پہنچی تھی۔ ۶۳ء میں جب مشہور چینی سیاح ہیون سانگ اس علاقے سے گزرا تو اس نے ٹیکسل کے قدیم شہر کوکھنڈرات کی شکل میں دیکھا۔ شہر اور دیہات برباد ہو چکے تھے۔ اور ہر طرف گھنے جنگل نظر آتے تھے وحشی جانوروں کے علاوہ رہن اور لٹیرے بھی پھرتے تھے۔ چنانچہ یہاں جو بھولا بھٹکا مسافر خونخوار جانوروں سے بچ نکلتا تھا۔ وہ انسانی درندوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر جاتا تھا۔ خود ہیون سانگ بھی ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹا۔ لیکن قسمت نے یادری کی کہ جان سلامت لے کر نکل گیا۔

گپت خاندان کا زمانہ سنسکرت علم و ادب کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس خاندان کا دوسرا بادشاہ سمرگپت نہ صرف ایک عظیم الشان اور طاقتور فرمان روا تھا۔ بلکہ اُسے شعر و ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ اُسے مہاراج ادھراج سے زیادہ کویراج کہلانے میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اہل علم سے میل جول رکھتا تھا۔ اور شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاعروں کے ساتھ اُس کے فیاضانہ سلوک نے شاعری اور فارغ البالی کے ازلی بے کو ختم کر دیا تھا۔ اُس کے دربار کا

سب سے بڑا شاعر ہری سین تھا۔ سندر گپت کا بیٹا چندر گپت ثانی علم و ادب کی سرپرستی کرنے میں اپنے باپ پر بھی سبقت لے گیا۔ اُس کا زمانہ گپت خاندان کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس نے وکرمادیتہ یعنی "سورج جیسی طاقت رکھنے والا" کا لقب اختیار کیا۔ اس راجہ کے دربار میں نہایت عالم و فاضل لوگ جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ اُس کے نو رتنوں کا تذکرہ آج تک تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔ عام روایت یہ ہے کہ سنسکرت زبان کا عظیم ترین ڈرامہ نگار کالی داس بھی اسی راجا کا درباری تھا۔ کالی داس کو سنسکرت کا شکسپٹر کہا جاتا ہے۔ اُس کے لکھے ہوئے ڈراموں کا ترجمہ تمام دنیا کی بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان ڈراموں میں شکنتلا کا شمار دنیا کی عظیم ترین ادبی کتابوں میں ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ڈرامہ لکھنے کا فن ہندی الاصل نہیں۔ بلکہ ادب کی یہ صنف یونانیوں کے ہمراہ ہندوستان میں پہنچی تھی۔ ڈرامے لکھنا اور کھیلنا صد ہا سال سے اہل یونان کا قومی شعار تھا۔ سکندر اعظم کے حملے کے بعد ہندوستان کے لوگوں نے بھی اس فن میں دلچسپی لینا شروع کی۔ چنانچہ کئی صدیوں کے مسلسل ارتقاء کے بعد ہندوستان میں ڈرامہ نگاری کا فن گپت خاندان کے زمانے میں اوج کمال پر پہنچا۔ کالی داس کے علاوہ بعض دوسرے ڈرامہ نگاروں نے بھی اُس زمانے میں نہایت بلند پایہ ڈرامے تصنیف کئے۔ جن میں سے پلچھکانگ، مدر راکشس اور دیوی چندر گپتم سنسکرت ادب میں نہایت بلند ادبی مقام رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں کا تانا بانا غیر ملکیوں کے خلاف اہل ہند کی جدوجہد کی کہانیوں سے تیار کیا گیا ہے۔ مدر راکشس یونانیوں کے خلاف ہندوستانیوں کی بغاوت کی داستان ہے۔ اس کا مرکزی کردار مدر راجے راکشس کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، یونانی حملہ آور ہے۔ یہ ڈرامے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے

ہیں کہ گپت راجاؤں کے زمانے میں حب الوطنی اور قومیت پرستی کے جذبات
 پورے طور پر نشوونما پا چکے تھے۔ بہت سے دوسرے باکمال شعرا مثلاً بان، مالویا،
 بھرتھی ہری، سبھندو، سری ہرش اور مہندر ورمن بھی اسی دور میں گزرے
 ہیں۔ پوران بھی جو قدیم ہندوستان کی تاریخی داستانوں پر مشتمل ہیں۔ اسی دور
 میں تصنیف ہوئے۔ اور یہ روایت بھی از روئے قیاس درست معلوم ہوتی ہے۔
 کہ مہا بھارت میں آخری اضافے بھی اسی دور میں ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کی آمد

اگرچہ مسلمانوں نے نوجوان جرنیل محمد بن قاسم کی قیادت میں ۷۱۲ء میں پہلی بار ہندوستان پر حملہ کیا لیکن ہندوستان، لنکا اور جزائر شرق الہند کے ساتھ ان کے تجارتی تعلقات اس سے بہت پہلے قائم ہو چکے تھے۔ محمد بن قاسم نے ملتان تک کا علاقہ فتح کر کے اسلامی سلطنت میں شامل کیا لیکن بدقسمتی سے اُسے اسلامی سلطنت کو مستحکم کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اُس نوجوان جرنیل اور دیر سیاست دان کی واپسی کے بعد تقریباً ایک سو سال تک سندھ میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی۔ لیکن چونکہ اُس زمانے میں مسلمانوں کی فتوحات کا رخ شمالی افریقہ اور جنوبی یورپ کی طرف پھر گیا تھا۔ اس لئے خلفائے بنو امیہ نے ہندوستان کے طرف چنداں توجہ نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مسلمانوں کے قدم ملتان سے آگے شمالی ہند کی طرف نہ بڑھ سکے بلکہ رفتہ رفتہ سندھ پر بھی اُن کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی۔ شمال مغربی ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے ۳۹۱ھ مطابق ۱۰۰۱ء میں شروع ہوئے۔ جبکہ سلطان محمود غزنوی نے دہلیا اور ہند

کے مقام پر شمال مغربی ہندوستان کے راجپوت راجہ انندپال کو شکست دی۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور تمام پنجاب اور ملتان کے علاقوں کو بھی فتح کر کے قلمرو غزنویہ میں شامل کیا۔ اس کے جرنیلوں نے فتوحات کے اس سلسلے کو اور آگے بڑھایا۔ اور دہلی اجمیر اور وسط ہند کے علاقوں کو بھی فتح کیا۔ چٹانچہ سلطان کے بہنوئی سالار ساہو نے اجمیر پر اسلامی علم لہرایا اور اسی سالار ساہو سے بیٹے سالار مسعود غازی نے راجہ ماہی پال کو شکست دے کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ سالار مسعود غازی نے اپنی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ حتیٰ کہ وہ بہرائچ کے مقام پر راجپوت راجاؤں کے ایک بہت بڑے متحدہ لشکر کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوا۔ سالار مسعود غازی کی شہادت کے بعد دہلی اور اُس کے پرے کے علاقے مسلمانوں کے قبضے سے نکل گئے۔ البتہ پنجاب بدستور غزنوی سلطنت میں شامل رہا۔ سلطان نے لاہور کے مقام پر اپنا ایک نائب مقرر کیا اور خود وہ اور اُس کے جانشین وقتاً فوقتاً قلعہ لاہور میں آتے جاتے رہے۔ جب غزنوی خاندان پر زوال آیا تو لاہور ہی اُن کا ملجا وامن ثابت ہوا۔ حتیٰ کہ سلطان محمد غوری نے اس خاندان کے آخری بادشاہ خسرو کو شکست دے کر پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔

مقامی روایات کے مطابق جو گکھڑوں کی منظوم تاریخ کے ”گورنامہ“ پر مبنی ہیں، محمود غزنوی نے جب سندھ کے اس طرف کے علاقے کو فتح کیا تو لوہٹوہار کا علاقہ اپنے ایک سردار کے گورہ المعروف گکھڑین شاہ کو عطا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ گورہ کو اس علاقے کی حکومت ملنے میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے عطا کی گئی۔ یہ فرمان اکبر آباد کے مقام پر ایک شاہی دربار میں پڑھ کر سنایا گیا۔ روایت ہے کہ اکبر آباد نامی قصبہ اسی مقام پر آباد تھا۔ جہاں آج کل راولپنڈی آباد ہے۔ گکھڑوں کا دعویٰ ہے کہ سلطان کے گورہ ساسانی خاندان کا شاہزادہ تھا اور لفظ گکھڑ درحقیقت

کے گوہر سے بگڑا ہوا ہے۔ چونکہ ان تمام واقعات کا اس زمانے کی مستند تواریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا نہ ہی سلطان محمود غزنوی کے امراء اور اراکین سلطنت میں کسی شہزادہ کے گوہر کا ذکر آتا ہے اور نہ ہی اکبر آباد نام کے کسی مقام کا تذکرہ ہے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے ان روایات کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ البتہ "کے گوہر نامہ" میں ان تمام واقعات کا نہایت تفصیلی طور پر بیان موجود ہے۔

جس زمانے میں سلطان محمود غزنوی نے علاقہ پوٹھوہار پر حملہ کیا۔ یہ تمام علاقہ غیر آباد اور جنگلات سے پٹا پڑا تھا۔ بڑے بڑے شہر جو کسی زمانے میں تہذیب و تمدن کے گہوارے تھے نابود ہو چکے تھے۔ اور کسی قسم کی مرکزی حکومت کا تصور ہی ناپید تھا۔ البتہ مختلف چھوٹے قبضے پائے جاتے تھے جہاں مختلف قبیلوی سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کی ہوئی تھیں۔ ان قبیلوں میں راول کا قبضہ خاص طور پر نمایاں تھا۔ یہاں راول نامی قبیلہ آباد تھا۔ جس کا سردار ستوگن اچھے خاصے اثر و اقتدار کا مالک تھا۔ اس سردار کا ذکر اس سے پہلے قدرے تفصیل سے آچکا ہے۔

ہندوستان میں بت پرستی ہزاروں سال سے مروج تھی لیکن مہایان فرقے کے عروج کے زمانے میں بت گری، بت فروشی اور بت پرستی لوگوں کی روزمرہ عبادات کا جزو بن گئی تھیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ٹیکسلا ایک زمانے میں بت تراشی اور بت پرستی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ جس کثرت سے اس شہر میں بت بنائے جاتے تھے۔ شاید کسی زمانے میں دنیا کے کسی حصے میں نہ بنائے جاتے ہوں گے۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت بھی بت پرستی پورے زور و شور سے جاری تھی۔ لوگ نہایت خوبصورت مندر بناتے تھے۔ جن میں مورتیاں سجائی جاتی تھیں اور ان مورتیوں کی پوجا انتہائی ذوق اور انہماک سے کی جاتی تھی۔ چونکہ بدھ مت زوال پذیر ہو چکا تھا۔ اس لئے اب ان مندروں

میں مہاتما بھگت کی بجائے کرشن رام شیو، وشنو اور اسی قہم کے دوسرے دیوتاؤں کی مورتیاں رکھی جاتی تھیں۔ پوٹھوہار کا علاقہ نسبتاً غیر متحد ہوا چکا تھا۔ اس لئے یہاں ویسے شان دار مندر نہ تھے جیسے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں پائے جاتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر بار بار حملے کیوں کئے؟ اس کے جواب میں عام طور پر غیر مسلم مؤرخین یہی کہتے ہیں کہ وہ اس دولت مند ملک کی دولت سمیٹ کر اپنی حکومت کو مستحکم اور افواج کو مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان سے حاصل ہونے والی دولت سے سلطان نے ضمنی طور پر یہ دونوں فائدے حاصل کئے لیکن اس کا بنیادی مقصد مال و دولت سمیٹنا نہ تھا بلکہ وہ راجپوت راجاؤں کی طاقت کو کچلنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کی وسطی ایشیا کی مہمات کے دوران کہیں غزنی پر حملہ کر دینے کی جرأت نہ کر بیٹھیں۔ خوش قسمتی سے سلطان کا دل اسلامی غیرت اور حیثیت کے جذبات سے بھی معمور تھا۔ اور اس کے اکثر و بیشتر امراء اور جرنیل بھی اسی جذبے سے سرشار تھے۔ سلطان کا ایک جرنیل سالار عطار اللہ غازی بڑا پڑھن جو شمس الملوک تھا اس جرنیل کے بیٹے سالار ساہو اور سالار قطب شاہ اور ان کے خاندان کے دوسرے ہزاروں جوان سلطان کی مہمات میں ہمیشہ شریک رہے۔ جب پوٹھوہار اور پنجاب کے علاقے مفتوح ہو کر غزنوی حکومت میں شامل ہوئے تو سالار قطب شاملے اس علاقے میں مستقل قیام اور تبلیغ اسلام کی اجازت مانگی۔ اجازت ملنے پر قطب شاہ اور اس کے ساتھی دریائے سندھ کے کنارے کالا باغ کے مقام پر قیام پذیر ہوئے۔ اس علاقے کے راجپوت راجاؤں کو ان کی آمد ناگوار گزری۔ چنانچہ سب سے پہلے دھکوٹ کے راجہ کلک نے قطب شاہ پر حملہ کیا۔

لیکن شکست کھائی اور کچھ عرصے کے بعد حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ راجہ کے پیروی میں اُس کی رعایا کے ہزاروں آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد قطب شاہ کو کئی دوسرے ہندو راجاؤں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ لیکن یکے بعد دیگرے اُن راجاؤں نے بھی شکستیں کھائیں۔ اور قطب شاہ اور اُس کے ساتھی فراغت اور اطمینان سے اپنے تبلیغی کاموں میں مصروف ہوئے۔ ان لوگوں کی پرجوش کوششوں سے رفتہ رفتہ تمام پوٹھوہار حلقہ بگوش اسلام ہو گیا اور بت پرستوں کا یہ دلیس آفتاب توحید کی کمرلوں سے منور ہو گیا۔

سلطان محمود غزنوی صرف ایک عظیم فاتح ہی نہ تھا بلکہ اُسے علم و ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ اُس نے اپنی فیاضی اور دریادگی کے بل بوتے پر اُس زمانے کے بڑے بڑے عالموں، شاعروں، فلسفیوں، مؤرخوں اور طبیعوں کو اپنے دربار میں جمع کر لیا تھا۔ شاعروں کی جتنی قدردانی اُس نے کی، شاید ہی دنیا کے کسی اور بادشاہ نے کسی بھی زمانے میں کی ہو۔ اُس کے ملک الشعراء عنصری کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ جیب اُس کی سواری نکلتی تھی تو چار سو زرین کمر غلام سواری کے ساتھ چلتے تھے۔ اُس کے آلات مطبخ سونے اور چاندی کے ہوا کرتے تھے۔ اور اُس کا اپنا دربار کسی بادشاہ کا دربار معلوم ہوتا تھا۔ البیرونی بھی، جس نے ہندوستان کے متعلق ایک نہایت تحقیقی اور مبسوط کتاب لکھی ہے اُس کے دربار سے وابستہ تھا۔ اُس کے درباری شعراء کے قصائد سے ہمیں اُس کی تمام مہمات کی تفصیلی رودادیں ملتی ہیں۔ اُس کے مؤرخین نے نہایت دیانت داری سے اس دور کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ چنانچہ البیرونی، عینی، ابوالفضل بہیقی اور دوسرے معاصر مؤرخین کی لکھی ہوئی کتابیں آج ہمارے لئے بیش بہا تاریخی سرمایہ ہیں۔ ان تاریخوں میں پوٹھوہار کے علاقے کا کہیں کہیں سرسری طور پر ذکر آتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے

کہ اُس زمانے تک اس علاقے کی سیاسی اہمیت بہت کم ہو چکی تھی۔ البتہ کشمیر کے راستے پر واقع ہونے سے یہ علاقہ فوجی نقطہ نگاہ سے اُس زمانے میں بھی اہم تھا۔ چنانچہ سلطان کو اس علاقے میں جا بجا مضبوط فوجی چوکیاں قائم کرنی پڑیں تاکہ کشمیر کے علاقے پر اُس کی گرفت مضبوط رہے۔

ہمسلمان محمود غزنوی نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کر کے لاہور میں اپنا ایک نائب السلطنت مقرر کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے چالیسینوں نے لاہور کو اپنا سرمائی مستقر بنا لیا۔ سلاطین کی آمد و رفت کے باعث اس علاقے میں بھی فارسی علم و ادب کا پیر چاہونے لگا۔ چنانچہ غزنوی دور کے دو بلند پایہ اور مشہور و معروف شاعر مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی علاقہ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ان دونوں شاعروں کی نگارشات فارسی ادب میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ مسعود سعد سلمان کی شاعری میں مقامی رنگ کا عنصر غالب ہے۔ وہ فارسی زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے موسم بہار کی بجائے موسم برہنگال پر قلم اٹھایا ہے اور جس نے اپنے وطن اور اُس کے درختوں، پھولوں اور سبزہ زاروں کی تعریف کی ہے۔ ان اوصاف اور زمانے کی اولیت کے اعتبار سے ہم اسے ہندی، ایرانی و بستان شاعری کا پیش رو کہہ سکتے ہیں۔

اسلام کی آمد سے ہندوستان کے قدیم مذہبی، تمدنی اور تہذیبی نظام میں نہایت خوشگوار اور دیرین انقلاب برپا ہوا۔ اس سے پہلے ہندوستان میں جو مذہبی اور معاشرتی نظام جاری تھا۔ اُس کی بنیاد دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور برہمنی مذہب کے عدم مساوات کے اصولوں پر قائم تھی۔ اسلام نے سب سے پہلے اس ملک کے رہنے والوں کو وحدت پرستی اور مساوات انسانی کے اصولوں سے روشناس کیا۔ وحدت پرستی، انسانی برابری اور مساوات کے اصولوں نے اہل ہند کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ جو لوگ اسلام کی آغوش میں آگئے

وہ تو بلا دراست اس کی ہمہ گیر خوبیوں اور برکتوں سے مستفیض ہوئے لیکن جو لوگ اپنے قدیم آبائی مذاہب پر قائم رہے۔ انہیں بھی اسلام کی برکتوں سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ ذات پات کی کڑی قیود جنہیں مہاتما بدھ کی آرفع اور اعلیٰ روحانی تعلیمات بھی نرم نہ کر سکی تھیں، اسلام کی آمد اور اہل اسلام کے اثر سے رفتہ رفتہ نرم ہونے لگیں۔ سستی اور دستبردگشی کی رسمیں بھی اتنی عام اور ہمہ گیر نہ رہیں۔ جتنی پہلے تھیں۔ خود ہندوؤں میں کئی ایسے روشن خیال مصلح اور رفیعا مرید پیدا ہونے لگے۔ جنہوں نے وحدت پرستی اور مساوات انسانی کے پرچار کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اور اہل اسلام پسندی کو جو ہندوؤں کے رگ وریش میں پیوست ہو چکی تھی۔ مٹا کر انہیں معقولیت پسندی اور حقیقت شناسی کی طرف مائل کیا۔

مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں اسلامی تصوف بھی آیا۔ قرون وسطیٰ میں تصوف نے مسلمانوں کے خیالات، اعمال اور طرز زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ مثلاً جب سید علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ اور اسی طرح کے دوسرے صوفیائے کبار ہندوستان میں وارد ہوئے تو انہوں نے اپنے افکار و اعمال سے اہل ہندو کو بہت متاثر کیا۔ ان بزرگوں کی باطنی زندگی کو دیکھ کر لاکھوں ہندو حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اور لاکھوں مسلمان بھی جو راہ راست سے بھٹکے ہوئے تھے۔ از سر نو راہ راست پر آ گئے۔

تاہم متقوفین خود بھی اہل ہند کے جوگیوں اور تیگیوں کے افکار و اعمال سے کچھ کم متاثر نہ ہوئے۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ ہندوستانی فقیروں اور درویشوں نے مسلمانوں سے صوفیاء اور فقراء کو کس حد تک متاثر کیا اور خود تصوف کے اصول و آئین میں ہندی فلسفہ مذہب و اخلاق میں کس قدر آمیزش ہے۔ لیکن اس بات سے کوئی لگھاڑھا انسان انکار نہیں کر سکتا کہ جسے ہم اسلامی تصوف کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ

خالصتاً اسلامی ہونا تو درکنار بڑی حد تک غیر اسلامی افکار و خیالات کا حامل ہے۔ اس میں عیسائیوں کی رہبانیت، یونانیوں کی اشراقیت، بودھوں کی نرم طبعی کے علاوہ ویدانت کا فلسفہ بھی پایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں آنے کے بعد متصوفین کے عقائد میں ویدانتی عقائد کی بہت زیادہ آمیزش ہوئی۔ لیکن ان تمام آمیزشوں کے باوجود تصوف کی روح بنیادی طور پر اسلامی ہی رہی۔

پوٹھوہار کے لوگ طبعاً مذہب پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے جو نہی اہل اسلام کا قدم اس علاقے میں آیا۔ یہ لوگ جوق در جوق مذہب اسلام کی آغوش میں آتے چلے گئے۔ ہم اُدپ بتا چکے ہیں کہ قطب شاہ اور اُن کے خاندان نے دریائے سندھ کو عبور کر کے پوٹھوہار کے علاقے میں اپنی سرگرمیاں شروع کی تھیں۔ چنانچہ سکیسر کے علاقے کے لوگ سب سے پہلے دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ قطب شاہ کی اولاد اپنے جدِ امجد کے نقش قدم پر چلتی رہی۔ چنانچہ اس خاندان کے افراد پوٹھوہار کے مختلف اضلاع میں پھیل گئے۔ اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ آج اس قبیلے کے لوگ جو قطب شاہی اعران کہلاتے ہیں، سرگودھا، میانوالی، کیمبل پور، راولپنڈی اور جہلم کے اضلاع میں بکثرت آباد ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کی آمد سے لے کر آج تک اس علاقے میں سیکڑوں درویش پیدا ہوئے جن میں سے کئی درویشوں کے مزار آج تک موجود ہیں۔ ان مزاروں پر ہر سال زائرین بڑے گہرے ذوق و شوق سے زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ اور وہاں عرس اور میلے منعقد کرتے ہیں۔ ایسے درویشوں کے مزارات پر جن کا نانہ حیات قریب تر ہے، عرس زیادہ دھوم دھام سے کئے جاتے ہیں۔ ان تمام مزاروں میں سے شاہ عبداللطیف المعروف تری شاہ کا مزار مشہور ترین ہے۔ یہ مزار راولپنڈی سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر شمال مغرب کی جانب واقع ہے۔ یہاں ہر سال مئی کے مہینے میں بارہ دن تک بڑی دھوم دھام سے میلہ کیا جاتا ہے۔ میلے میں

قوالیاں ہوتی ہیں اور رقص و سرود کی محفلیں جیتی ہیں۔ بیسیوں طوائفیں سرود و سماع سے نائزین کو محفوظ کرتی ہیں اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ کر لے جاتی ہیں۔ رقص و سرود کے علاوہ دوسرے فواحش کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اوباش قسم کے لوگ، شراب نوشی اور قمار بازی بھی کھیتے ہیں۔ ان برائیوں کے سد باب کے لئے حکومت نے ۱۹۵۹ء سے اس درگاہ پر طوائفوں کی آمد پر پابندی کر دی ہے۔ اس سے عیش پسند لوگوں کے نقطہ نظر سے میلہ کچھ مچھیکا سا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو فقیر سے ولی عہدیت رکھتے ہیں۔ حکومت کے اس اقدام کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

شاہ بڑی لطیف آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے گزرے ہیں۔ انہوں نے یہاں ایک چشمے پر بیٹھ کر چلہ کشی کی اور اپنی درویشانہ صفات کی بنا پر مرجع خاص و عام ہوئے۔ ان کی ذات سے بہت سی کرامتیں اور خرق عادت واقعات منسوب کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے بیشتر قبائلیہ آمیز معلوم ہوتے ہیں۔ نورپور شاہاں کا تاریخی قصبہ اب پاکستان کے نئے صدر مقام اسلام آباد کا ایک حصہ ہے۔

دوسری بڑی خانقاہ گولڑہ شریف کے مقام پر ہے۔ گولڑہ راولپنڈی سے چھ میل مغرب کی طرف ایک نہایت پُر فضا مقام ہے۔ یہاں پر سید مہر علی شاہ صاحب کا مزار ہے۔ شاہ صاحب موصوف ایک جید عالم اور بڑے پائے کے محدث تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اپنے عقیدتمندوں کو قرآن اور حدیث کی تعلیم دی اور ریاضت و عبادت میں مصروف رہے۔ یہاں بھی سالانہ عرس ہوتا ہے۔ جس میں ہزار ہا مرید دور دور سے آکر شامل ہوتے ہیں۔ یہ عرس نورپور شاہاں کے عرس سے بالکل مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ مزار پر قرآن خوانی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ نعت خوانی اور قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن بلجے گلبے اور رقص و سرود کی قطعاً اجازت نہیں۔

اگر ہم پوٹھوہار کے دیہات کی سیاحت کریں۔ تو ہمیں کئی مقامات پر ایسے مزارات ملیں گے۔ جہاں عرس اور میلے کئے جاتے ہیں۔ گوجر خان کے علاقے میں کلیام اعوان کے مقام پر خواجہ فضل الدینؒ کا مزار ہے۔ جہاں ہزاروں عقیدت مند زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ مری کی پہاڑیوں میں پوٹھوہار کے مقام پر ڈھوڑ بٹائی قبیلے کے جد امجد ملک سورج خانؒ کا مزار مرجع خاص وعام ہے۔ اس مقام سے چند میل کے فاصلے پر موٹہ شریف میں ایک بزرگ پیر محمد قاسمؒ مدفون ہیں۔ یہاں بھی ہر سال جون کے مہینے میں عرس ہوتا ہے۔

مسلمان بزرگوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کے کئی متبرک مقام بھی اس علاقے میں ملتے ہیں۔ حسن ابدال کے مقام پر پنج صاحب سکھوں کا بہت بڑا تیرتھ ہے۔ اسی طرح جہلم کے ضلع میں گٹھس راج ہندوؤں کا متبرک استھان ہے۔ مری میں کشمیر لوآنٹ کے قریب پانچ پانڈو کی بیٹھک ہے۔ جہاں قیام پاکستان سے پہلے ہر مہینے پورن ماشی کے دن میلہ لگا کرتا تھا۔

یہاں خاتواہوں اور مزاروں کی تفصیل مطلوب نہیں بلکہ اس مختصر تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ اہل پوٹھوہار کے طبعی میلانات، اور مذہبی رجحانات کا نہایت اجمالی سا بیان ہو جائے۔ اہل پوٹھوہار میں غیرت مندی راست بازی، خلوص اور مردانگی کی صفات بہت کچھ انہی طبعی میلانات اور مذہبی رجحانات کی مرہون منت ہیں۔

قرون وسطیٰ

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اہل پوٹھوہار کا جذبہ حریت پسندی ہر زمانے میں ناقابلِ تسخیر رہا ہے۔ جب محمود غزنوی نے ۳۹۹ھ میں انند پال دانی لاہور کے خلاف یلغار کی تو اُس کی فوجوں کو منجملہ دوسری افواج کے لگھڑوں کے ایک زبردست لشکر سے بھی نیرو آزمایا ہونا پڑا۔ لگھڑوں کا یہ لشکر راجپوتی فوج کا ایک حصہ تھا۔ اس لشکر کے مشہورانہ انداز جنگ کے متعلق فرشتہ لکھتا ہے۔

”سُلطان کی زبردست پیش بندیوں کے باوجود جب گھمسان کا رن پڑا تو تیس ہزار جنگجو لگھڑ جو سوار پاؤں سے تنگے اور جھالوں، نیروں اور اسی قسم کے دوسرے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ دو طرف سے مسلمانوں کی صفوں کو توڑ کر آگے بڑھے۔ انہوں نے سُلطانی رسالے کی صفوں کو درہم برہم کر دیا اور سواروں کے درمیان گھس کر گھوڑوں اور سواروں کو یکساں طور پر اپنے نیروں، تلواروں اور خنجروں سے کاٹنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ چند منٹوں کے اندر اندر تین چار ہزار مسلمان سپاہی شہید ہو گئے۔ اُن کی یہ کامیابی اتنی اچانک، غیر متوقع اور زبردست تھی کہ سُلطان نے

اُن کے جوشیں تہوڑ کو دیکھتے ہوئے اس گھسان کے معرکے سے پیچھے ہٹ جانا مناسب خیال کیا۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے بانی سلطان محمد غوری کو گکھڑ قبائل کی شورشوں اور بغاوتوں کا مسلسل اور متواتر مقابلہ کرنا پڑا۔ اگرچہ دہلی میں سلطان کی حکومت مستحکم طور پر قائم ہو چکی تھی۔ لیکن اس علاقے کے گکھڑ قبیلے ہمیشہ بغاوت کا جھنڈا بلند کئے رکھتے تھے۔ انہی بغاوتوں کو فرو کرنے کے سلسلے میں آخر کار اسے دھمک کے مقام پر ۱۲۲۶ء میں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

شیر شاہ سوری کو اپنے مختصر زمانہ حکومت میں گکھڑ قبائل کی شورشوں نے اتنا تنگ کیا کہ اُس نے انہیں دبانے اور مطیع فرمان رکھنے کے لئے جہلم کے کنارے ایک مضبوط قلعے کی بنیاد رکھی۔ یہ قلعہ رہتاس گڑھ کے قلعے کے غونے پر تعمیر کیا گیا۔ لہذا شیر شاہ نے اس قلعے کا نام بھی قلعہ رہتاس رکھا۔ شیر شاہ کی زندگی میں یہ قلعہ مکمل نہ ہو سکا۔ اس لئے اُس کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے سلیم شاہ نے اُسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ محلوں کے زمانے میں یہ قلعہ باقاعدہ مضبوط فوجی چوکی کا کام دیتا رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پورھوہار کی حیثیت قرون وسطیٰ میں ایک نیم خود مختار علاقے کی سی رہی۔ مسلمان شہنشاہ چونکہ بنگال، بہار، اڑیسہ، گجرات اور دکن کے علاقوں کی تسخیر و تنظیم کی طرف متوجہ رہے۔ اس لئے انہوں نے اس مختصر سے علاقے کی زیادہ پروا نہ کی۔ چونکہ اس علاقے میں قابل کاشت زمین کم تھی اور جتنی کچھ تھی وہ بھی چنداں زرخیز نہ تھی۔ اس لئے سلاطین دہلی کو مالے کی صورت میں کچھ زیادہ یافتہ نہ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ لوگ باغی اور سرکش قسم کے تھے۔ لہذا مسلمان شہنشاہوں نے انہیں اپنے حال پر رہنے دیا۔ وہ اسی بات پر مطمئن رہتے تھے کہ اس علاقے کے سردار اُن کی اطاعت کا دم بھرتے رہیں۔ اندرونی طور پر ان سرداروں میں باہمی سرمچھٹول اور مناقشات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

لیکن شاہانِ دہلی اُن کے اندرونی معاملات اور مناقشات میں زیادہ دخل انداز نہ ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات کے ابتدائی زمانے سے لے کر مغل شہنشاہوں کے زریں دورِ حکومت تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ ادھر گھڑسواروں میں بھی کوئی غیر معمولی طور پر قابل اور طاقتور حکمران پیدا نہ ہوا۔ جو تمام سرداروں کو مطیع کر کے اپنی ایک خود مختار حکومت قائم کر لیتا۔ باہم خانہ جنگی اور مناقشت کی وجہ سے علاقے کے سیاسی اور معاشرتی حالات بہت ابتر رہے۔ ان حالات کے پیش نظر تجارت اور زراعت میں کسی قسم کی ترقی کا امکان ہی نہ تھا۔ چنانچہ زراعت کی حالت ناگفتہ بہ رہی۔ زمین کے وسیع و عریض قطعات بنجر ہو گئے۔ اور جہاں کسی زمانے میں سرسبز کھیت لہلہا یا کرتے تھے وہاں رفتہ رفتہ جنگل نمودار ہو گئے۔ جب علاقے کے سیاسی، معاشرتی اور معیشتی حالات ایسے ہوں تو کسی قسم کی علمی، تہذیبی یا تمدنی ترقی کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ ملک کے انتہائی پسماندہ علاقوں میں شمار ہونے لگا۔ اور اباب حکومت اُس کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے۔

ان حالات کی بناء پر پوٹھوہار کا علاقہ جو کسی زمانے میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بڑا مرکز تھا۔ نیم تمدن لوگوں کا وطن بن گیا۔ زراعت اور تجارت کی کمی، جنگلات کی زیادتی اور شاہراہوں کے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے وہ قدیم شاہراہ جو وسط ایشیاء کے علاقوں کو ہندوستان کے سرسبز شاداب میدانوں سے بلاتی تھی۔ متروک ہو گئی۔ اور اب مسافروں اور تاجروں کے قافلے پوٹھوہار کی جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ گزرنے لگے۔ چنانچہ سلطان محمود غزنوی اور محمد غوری کے بعد جتنے بھی مسلمان فاتح افغانستان کی طرف سے آئے۔ وہ ملک کے جنوب کی طرف سے گزر کر سون سکیسر کی پہاڑیوں کو عبور کرتے ہوئے شاہ پور کے میدان میں اترتے اور وہاں سے لاہور یا ملتان تک پہنچتے تھے۔

جب جلال الدین خوارزم شاہ نے چگیز خان کے ہاتھوں ایک کی جنگ میں شکست
 کھا کر دریا کو عبور کیا تو دریائے اس طرف کا تمام علاقہ جنگل سے پٹا پٹا تھا جس میں
 ہر طرف وحشی درندوں کی بھرمار تھی۔ سلطان نے جنوبی راستہ اختیار کیا۔ اور متصل
 کے ریگستانی علاقوں میں سے گزرتا ہوا پنجاب کے میدانوں میں پہنچا۔ وہاں سے
 سلطان دہلی کے نواح میں پہنچا۔ لیکن شمس الدین التمش نے اُسے سیاسی وجوہ
 کی بنا پر پناہ دینے سے گریز کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطان جلال الدین ملتان ہوتا ہوا کمران
 اور سیستان کے راستے ایران چلا گیا۔ یہ واقعہ ۱۲۲۳ء کا ہے۔

اس واقعے کے ٹھیک ایک سو پچتر برس بعد ۱۲۴۱ء ۸۰۱ھ مطابق ۲۴ ستمبر ۱۳۹۹ء
 کو امیر تیمور نے عین اسی مقام پر دریائے سندھ کو دھجے اُس نہانے میں دریائے
 نیلاب کہا جاتا ہے) عبور کیا۔ دریا کو عبور کرنے کے بعد امیر نے مقامی زمینداروں کو بلوایا۔
 اور اُن سے پوچھا کہ ملتان کی طرف جانے کے لئے موزوں ترین راستہ کونسا ہے؟ زمینداروں
 نے کہا کہ دو راستے ہیں۔ ایک راستہ (اغلباً چکوال میں سے گزر کر جلنے والا) سرسبز و
 شاداب لیکن نسبتاً طویل تر ہے۔ دوسرا راستہ چول جرد میں سے گزرتا ہے۔ یہ راستہ
 مختصر تو ضرور ہے لیکن ریگستانی ہے اور روز ہا روز کی مسافت میں کہیں پینے کے لئے
 پانی یا مویشیوں کے لئے چارادستیاب نہیں ہوتا۔ زمینداروں نے یہ بھی کہا کہ اس
 ریگستانی علاقے کا اب نام چول جرد کی بجائے چول جلال ہے۔ چول اغلباً متصل کا
 مغرب ہے) کیونکہ سلطان جلال الدین نے پنجاب تک پہنچنے کے لئے یہی راستہ اختیار
 کیا تھا۔ امیر تیمور اپنی تونک میں کھتا ہے کہ:-

”جب میں نے یہ بات سنی تو فوراً ارادہ کر لیا کہ میں بھی یہی ریگستانی
 راستہ اختیار کروں گا۔ چنانچہ میں نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ تمام فوج
 اپنے ساتھ کئی دن کے لئے پانی کا ذخیرہ اور دوسری اشیائے ضرورت

لے کر کوچ کے لئے تیار ہو جائے۔

بابر بھی پوٹھوہار کی قدیم شاہراہ کی بجائے ٹکڑہار کی وادی کے راستے ہندوستان کی طرف آیا تھا۔ چونکہ وہ قدرتی مناظر کا شیدائی تھا۔ لہذا اس نے وادی ٹکڑہار کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے اس مقام پر ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد بھی تعمیر کی تھی جو آج تک موجود ہے۔

مسلمان فرماں رواؤں میں سے شیر شاہ سوری نے اسی پرانی شاہراہ اعظم کو از سر نو آمدورفت کے قابل بنایا جو جہلم رتھاس اور ٹیکسلا میں سے گزر کر اٹک تک پہنچتی ہے۔ آج کل کی گرینڈ ٹرنک روڈ تقریباً اسی سڑک پر گزرتی ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنوایا تھا۔ اس سڑک کے بنوانے کا مقصد یہ تھا کہ شیر شاہی افواج اٹک تک اور اٹک سے گزر کر کابل تک تیزی سے پہنچ سکیں۔ شیر شاہ بابتا تھا کہ ہالیوں ایک دن ایران سے واپس آئے گا۔ اور افغان اور مغل فوجیں ایک بار پھر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہوں گی۔ اس آنے والے خطرے کی پیش بندی کے لئے ضروری تھا کہ فوجوں کی نقل و حرکت کے لئے قریب ترین اور عمدہ ترین شاہ راہ بنوائی جائے۔ شیر شاہ سوری کے بعد اکبر اعظم نے اٹک کے مقام پر ایک نہایت پختہ اور سنگین قلعہ تعمیر کرایا۔ تاکہ اس شاہراہ کی پورے طور پر حفاظت کی جا سکے۔ یہ قلعہ آج بھی اٹک کے کنارے موجود ہے۔ اور منجگی اور استحکام کے اعتبار سے آج بھی ولیا ہی ہے۔ جیسا آج سے تین سو سال پہلے تھا۔

جہانگیر نے اپنی توڑک میں پوٹھوہار کے علاقے کے متعلق نہایت تفصیل سے لکھا ہے اس کے اقتباسات ہم اس سے پہلے دے چکے ہیں۔ جہانگیر نے پوٹھوہار کے لوگوں بالخصوص گکھڑوں کے متعلق لکھا ہے کہ یہ عجیب و غریب لوگ ہیں۔ آپس میں ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے بھی ان کے درمیان ایک جھگڑے کا تصفیہ کرنے

کی کوشش کی لیکن بے سود۔

ان تفصیلات کی تحریر سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ان سیاسی، معاشرتی، اور مجلسی حالات کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا جائے۔ جو محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر مغلوں کے عہد تک اس علاقے میں رونما رہے۔ یہ حالات یقیناً علم و ادب کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بنے رہے۔ غلام، غلجی، تغلق، سید اور پٹھان بادشاہوں کے زمانے میں دہلی اور لاہور تہذیب و تمدن کے بہت بڑے مراکز بن گئے۔ اُس دور کے مسلمان بادشاہوں نے اُن ایرانی علماء، فضلا، کی بید قدر افزائی کی جو منگولوں کے حملوں کے دباؤ کی وجہ سے یا بعد ازاں ایران میں سیاسی اور مجلسی انتشار کی وجہ سے ہندوستان میں آتے رہے۔ ان بادشاہوں نے لاہور، دہلی، جالندھر، فیروز آباد اور دوسرے اہم مقامات پر اسلامی تعلیم و تدریس کے بہت بڑے بڑے مراکز قائم کئے۔ اس کے علاوہ بہت سے مقامات علی الخصوص دہلی اور لاہور میں عظیم الشان کتب خانے بھی بنائے۔ ان میں سب سے بڑا کتب خانہ دہلی کا شاہی کتب خانہ تھا جہاں جلال الدین غلجی نے اپنے عہد میں امیر خسروؒ کو اس کا مہتمم مقرر کیا تھا۔ ان علمی مراکز میں امیر خسروؒ اور حسن دہلوی جیسے باکمال شاعر، مولانا خواجگی اور احمد تھانیسروی جیسے بلند پایہ علماء اور منہاج الدین، ضیاء الدین برنی، یحییٰ بن احمد اور شمس سراج جیسے عالی مرتبہ مؤرخین نشوونما پاتے رہے۔ اُس زمانے میں علمی اعتبار سے بخارا اس قدر ترقی کر چکا تھا کہ تمام رونے زمین پر اس شہر جیسے عالیشان مدارس کہیں نہ ملتے تھے۔ چنانچہ اس شہر کی علمی عظمت کے اعتبار سے اسے یونیورسٹیوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ اس شہر کا اگر کہیں کوئی جواب تھا تو وہ سلاطین ہند کا پایہ تخت دہلی تھا چنانچہ امیر خسروؒ نے بھی اس امر کا نہایت فخریہ انداز میں بیان کیا ہے۔

عین اُس زمانے میں جبکہ مسلمان بادشاہوں کی علم پروری اور ادب نوازی کی بدولت ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں علم و حکمت کے دریا بہہ رہے تھے،

پوٹھوہار کا علاقہ علم و دانش کی روشنی سے بڑی حد تک محروم رہا۔ اس محرومی کی بڑی وجہ وہی حالات تھے۔ جن کا بیان ہم اوپر کرتے ہیں۔ تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کرنا چاہیئے کہ اہل پوٹھوہار تمام کے تمام جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے ایسا ہونا ایک خلاف واقعہ امر ہوتا۔ کیونکہ انسانوں پر اسلام کا سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ یہ جس سرزمین میں پہنچتا رہا اپنے ساتھ علم و حکمت کی روشنی لاتا رہا۔ جس سے جہالت کے گہرے اندھیروں میں بھٹکنے والے لوگ کسی حد تک ضرور مستفیض ہوتے رہے جب اس علاقے میں اسلام پھیلا تو علم کے چشمے بھی پھوٹ پڑے۔ البتہ ہندوستان کے باقی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے مقابلے میں اہل پوٹھوہار نے ان سے استفادہ بہت کم کیا۔

مغلوں کے زمانے میں ہندوستان علم و فضل، شعر و ادب، فنون لطیفہ اور فن تعمیر میں اوج کمال پر جا پہنچا۔ بابر کے ایک وزیر سید مقبر علی کی تاریخ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس بادشاہ کے زمانے میں محکمہ تعمیراتِ عامہ کے فرائض میں سے ایک بڑا فرض یہ تھا کہ سکولوں اور کالجوں کے لئے عمارات تعمیر کرے۔ ہمایوں تو مطالعہ کتب کا دلدادہ تھا۔ وہ خاص طور پر علم نجوم اور علم جغرافیہ کا شائق تھا۔ اسی علمی شوق کے باعث اُسے وہ حادثہ پیش آیا جو اُس کی موت کا باعث بنا۔ چنانچہ ہم اگر اس بادشاہ کو ”شہیدِ علم“ کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ اس کے شوقِ مطالعہ کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ سفر میں بھی وہ چیدہ چیدہ کتابوں پر مشتمل ایک مختصر سا کتب خانہ اپنے ہمراہ رکھتا تھا۔ اکبر خود تو پڑھا لکھا نہ تھا لیکن اُس کا زمانہ دانش گاہوں اور دہستانوں کی ترقی اور پیش رفت کا خصوصی دور ہے۔ چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے کہ تمام ممالک میں نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ادارے ہیں۔ لیکن ہندوستان اپنی درس گاہوں کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ جہانگیر نے ایک خاص فرمان جاری کیا تھا کہ کسی لاؤلد امیر

آدمی یا کسی مسافر کی موت پر اس کا تمام مال و متاع حکومت کے خیال لے گی۔ اور یہ مال و متاع بھی درسگاہیں تعمیر کرنے اور چلانی درسگاہوں کی عمارتوں کی مرمت کرنے کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ جہانگیر کے بعد شاہ جہان کا زریں دور آیا۔ اور اگرچہ یہ بادشاہ تعمیرات کا خاص طور پر والد و شہید تھا۔ لیکن طلباء اور علما کو دل کھول کر انعام و اکرام اور وظائف دینے میں بھی کسی اور بادشاہ سے کم نہ تھا۔ اس نے دہلی میں ایک کالج قائم کیا۔ اور دارالبقا نامی ایک درسگاہ کی مرمت بھی کی جو شکستہ اور خستہ حالت میں تھی۔ تخت سے دست برداری کے بعد اس نے ایک مدرسہ کھولا جہاں وہ خود بچوں کو تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس سے اس کے علمی ذوق و شوق کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ جہان کا بڑا بیٹا داراشکوہ ایک عظیم المثال عالم تھا۔ وہ فارسی اور سنسکرت ہر دو زبانوں میں مہارت تامہ رکھتا تھا۔ تقوف سے اسے خاص طور پر نہایت قریبی لگاؤ تھا۔ اس نے اپنشدوں، مہکوت گیتا، یوگا و سستھا اور رامائن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اگر داراشکوہ شاہزادہ نہ ہوتا۔ اور سیاست کے خارزار میں الجھ کر نہ رہ جاتا تو اپنے دور کا بہت بڑا صوتی ہوتا۔ اورنگ زیب ایک نہایت سلجھا ہوا عالم دین تھا۔ فقہ اسلامی سے اسے خاص طور پر گہرا شغف تھا۔ چنانچہ اس کی تدوین کرائی ہوئی کتاب ”فتاوائے عالمگیری“ آج تک اپنے موضوع پر سندھائی جاتی ہے۔

مغلوں نے عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ شاہزادیاں اور عالی نسب بیگمات علم و ادب میں گہری دلچسپی لیا کرتی تھیں۔ چنانچہ اس عہد کی مشہور و معروف خواتین میں سے شہزادی گلبدن بیگم جو ”ہایوں نامہ“ کی مصنف ہے۔ سلیم سلطانہ، نور جہاں ممتاز محل، جہاں آرا بیگم اور شہزادی زیب النساء کے نام آج تک تاریخ ادب میں زندہ ہیں۔ نور جہاں اور زیب النساء کی شعر گوئی اور شعر فہمی کی داستانیں تو زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں نہ تو ہم مغلیہ دور میں علمی ترقی کی پوری تفصیل دے سکتے ہیں نہ ایسی تفصیل دینا ہمارے موضوع کے دائرے میں ہے۔ ہمیں تو اپنی مطالعاتی توجہ کو صرف خطہ پوٹھوہار کی علمی، ادبی ترقی پر مرکوز کرنا ہے۔ یہ امر بدیہی طور پر واضح ہے کہ علم و فضل کے اس سنہری دور میں، جبکہ تمام ہندوستان کا ذہنی آفاق علم کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ کسی حصہ ملک پر علمی جمود طاری نہ ہو سکتا تھا۔ یہ زمانہ امن و امان اور خوشحالی کا تھا۔ اور عام انسانی زندگی مجلسی، سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے انتہائی عافیت میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پوٹھوہار کے علاقے میں بھی اس جگمگاہٹ کے روشن اور واضح آثار ملتے ہیں۔ اُس زمانے میں ہر چھوٹی بڑی مسجد میں علمی مکاتب قائم تھے۔ جہاں بچوں کو دینی اور دنیوی تعلیم دی جاتی تھی۔ فارسی زبان ہر چہرہ کہ ابست مغلوں کی شاہی زبان نہ تھی لیکن ہندوستان میں آکر بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ حکومت کے تمام دفاتر میں یہی زبان چلتی تھی۔ اس لئے تعلیمی اداروں میں سب سے پہلے یہی زبان سکھائی جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسلامی تعلیمات کا بہت بڑا ذخیرہ بھی اسی زبان میں تھا۔ اس لئے لوگ مذہبی معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی فارسی ہی کو ذریعہ بناتے تھے۔ اسی زمانے میں تعلیم و تدریس کے اس شہرہ آفاق نصاب کا آغاز ہوا۔ جو سعدی کی نہایت آسان مثنوی کریمیا سے شروع ہو کر نظامی گنجوی کی لفظی اور معنوی ہر دو اعتبار سے پر شکوہ نظم ”سکندر نامہ“ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

یہ نصاب طلباء کو فارسی نظم و نثر پر پوری طرح حاوی ہوتے کے لئے ایک محسوس اور نہایت مضبوط بنیاد کا کام دیتا تھا۔ فارسی زبان کی تدریس ایسے عمدہ اور سائنسی طریقے سے کی جاتی تھی کہ مکتبوں میں پڑھے ہوئے لوگ اس زبان میں پوری پوری مہارت حاصل کر لیتے تھے۔ تدریس کا یہ نصاب اور طریقہ آج سے بیس پچیس سال پہلے تک رائج رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی پاکستان کے سرب آوردہ فارسی دان ابتدائی

طور پر انہی مکتبوں کے تعلیم پائے ہوئے ہیں۔

فارسی کی تدریس کا ایک نہایت اہم پہلو خوش خط نویسی تھا۔ مذہبی وجوہ کی بنا پر مسلمانوں میں مصوری کسی دور میں بھی مقبول عام نہیں رہی۔ جن لوگوں کو فطری طور پر مصوری سے لگاؤ ہوتا تھا وہ اپنی اس لگن کو پورا کرنے کے لئے خطاطی اور خوشنویسی کی طرف توجہ دیتے تھے۔ چنانچہ خط نستعلیق، خط نسخ، خط گلزار، خط طاووس اور اسی طرح کے دوسرے خط اسی لگن کی بدولت وجود میں آئے ہیں۔ فارسی زبان کی ایک مشہور شعری کہاوت

گر تومی خواہی کہ باشی خوشنویس
می نویس وی نویس وی نویس

عوام میں بہت مقبول تھی۔ لکھنا، لکھنا، مدام لکھنا ان کی تعلیمی زندگی کا ایک نہایت اہم اور نمایاں پہلو تھا۔ چنانچہ انہوں نے ہمیشہ اس میں حصول کمال کو اپنا مقصد اور مدعا بنالیا۔ پوٹھو ہار کے علاقے میں تقریباً ہر ٹپھے لکھے گھرانے میں قدیم قلمی مسودات آج تک محفوظ ہیں۔ اور یہ گھرانے اپنے ان علمی نوادر کو کسی قیمت پر بھی فروخت کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ بعض بڑے گھرانوں میں ان قلمی نسخوں کے بیش بہا ذخیرے پائے جاتے ہیں۔ ان قلمی نسخوں کی تیاری میں جس محنت اور وقت نظر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وہ داد تحسین کے قابل ہے۔ صرف خط کی عمدگی پر ہی اکتفا نہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ سطور کی زیب و زینت اور صفحوں کی آرائش کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اور تو اور حاشیہ نگاری بھی ایسی، خوبصورتی سے کی جاتی تھی کہ آج کل کے زمانے میں کوئی کیا کرے گا۔ قلم کے قوط اور سیاہی میں اول سے لے کر آخر تک ایسی حیرت انگیز یکسانیت ہوا کرتی تھی کہ دیکھ کر دل بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھتا ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ کتاب کی ظاہری شکل و صورت کو اتنا جاذب نظر بنا دیا کرتے تھے کہ دیکھ کر خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہے۔

چھاپہ خانوں کی ایجاد سے پہلے تمام کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اس لئے وہ کتاب جو عمدہ لکھنے والے اور اپنے فن میں ماہر ہوتے تھے۔ کتابیں لکھ کر اپنے لئے معقول و بھر معاش پیدا کر لیتے تھے بڑے بڑے شہروں بالخصوص علمی مراکز اور کتب خانوں میں اچھے کتابوں کی ہمیشہ بہت مانگ رہتی تھی۔ بادشاہ اور امراء ان کتابوں کی سرپرستی کرتے اور انہیں دل کھول کر انعام و اکرام دیا کرتے تھے۔ فن کتابت صرف ایک باعزت ذریعہ معاش ہی نہ تھا بلکہ اعلیٰ ذوق کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ نوجوان طلباء اور علم و ادب سے شغف رکھنے والے لوگ خود کتابیں لکھ لکھ کر اپنی ذاتی لائبریریاں بنایا کرتے تھے۔ ہر علمی خاندان میں کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ باعث فخر و مباہلات سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ اور بڑے بڑے امراء و وزراء ہمیشہ ایسے لوگوں کے ہاں جانے میں خوشی محسوس کرتے تھے جن کے ہاں اچھے کتب خانے پائے جاتے۔ ایسے لوگوں کی راج دربار میں بڑی عزت ہوتی تھی۔ اور بسا اوقات انہیں حکومت کے بڑے بڑے محکمہ تفویض کئے جاتے تھے۔

اس علاقے میں سب سے زیادہ سعدیؒ اور حافظ کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن دوسرے شعرا اور ادباء کی تصانیف بھی نہایت ذوق و شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ چنانچہ تصوف سے دلچسپی رکھنے والے لوگ مشنوی مولانا رومؒ کا مطالعہ بڑے شوق اور انہماک سے کرتے تھے۔ مذہبی علماء بھی جو بسا اوقات تصوف سے بیگانہ اور کبھی کبھی متصوفین کے مخالف بھی ہوا کرتے تھے۔ مشنوی مولانا رومؒ ضرور پڑھا کرتے تھے اور اپنے مواعظ کو اس کے رمزیہ اشعار سے دلچسپ اور رنگین بنایا کرتے تھے۔ مشنوی مولانا رومؒ کے بعد مقبول ترین کتاب فردوسی کا شاہنامہ تھی۔ اس کے علاوہ ہر لکھا پڑھا آدمی امیر خسروؒ کی غزلوں اور مولانا جامی کی نعتوں سے بھی ضرور محظوظ و مشغوف ہوتا تھا۔

شعراء کے کلام سے محفوظ و مشغوف ہونے کے علاوہ شعر گوئی بھی اہل علم کے پسندیدہ مشاغل میں شامل تھی۔ چنانچہ اچھے پڑھے لکھے لوگ عام طور پر اس فن میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اس علاقے کے بہت سے ایسے شعراء کے تذکرے ملتے ہیں جنہوں نے مختلف اصنافِ سخن بالخصوص غزل اور متصوفانہ مثنویوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بد قسمتی سے اس خطے میں کوئی ایسا بلند پایہ اور عظیم الشان شاعر پیدا نہیں ہوا۔ جس نے شعر و ادب کی تاریخ میں مستقل حیثیت حاصل کی ہو۔ تاہم مغل دور کے دو ایسے شعراء کا ذکر ضروری ہے جو اس علاقے کے رہنے والے تھے۔ اور جن کا تذکرہ پڑھے لکھے لوگوں میں آج تک پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک سلطان شادمان خان تھا اور دوسرا شاہ مراد، شادمان مغل شہنشاہ شاہجہان کے زمانے میں گزرا ہے۔ اور شاہ مراد اورنگ زیب کے زمانے میں۔ شاہ مراد پکوال کے قریب ایک گاؤں پر رہنے والے تھے۔ جسے آجکل تکیہ شاہ مراد کہا جاتا ہے۔ زبانی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی اور پنجابی دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر تھے۔ لیکن بد قسمتی سے ان کا کلام طبع نہیں ہوا۔ اس لئے ہم کلام کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہیں سلطان شادمان کا کلام البتہ دستِ بردِ حوادث سے بچ نکلا ہے۔ جسے ان کے اخلاف میں سے کسی صاحبِ ذوق نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ غزلیات پر مشتمل ہے اور ۱۸۹۹ء میں لاہور میں طبع ہوا۔

سلطان شادمان ایک گکھڑ سردار تھا اور مشہور و معروف سلطان سازنگ کی اولاد میں سے تھا۔ جو ہمالیوں کے زلنے میں قلعہ روات کا حاکم تھا۔ اس کے کلام کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُسے نہ صرف فارسی زبان و بیان پر عبور حاصل تھا۔ بلکہ مختلف محاورے سخن بالخصوص تشبیہ و استعارہ پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ تغزل میں وہ حافظ شیرازی کا پیرو تھا۔ چنانچہ اس کے دیوان کی پہلی غزل کی زمین میں

سچہ کچھ عرصہ ہوا پکوال کی بزم شاہ مراد نے کلام شائع کیا ہے۔

ہے۔ متعدد دوسری غزلیں بھی حافظ کی غزلوں کی بجور اور ردیف و قافیہ میں ملتی ہیں۔ اس کے کلام میں ایک حد تک رنگینی اور شیرینی ملتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں محاورے کی معمولی لغزش بھی پائی جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسی زبان بھی استعمال کی گئی ہے۔ جیسے اہل زبان طنزاً ”پارسی ہندی“ کہا کرتے ہیں۔ یہاں شادمان کے چند اشعار کا مطالعہ خالی از لطف نہ ہوگا۔

بیاساقی و آساں گن براہ عشق مشکل ہا
کہ دردِ جامِ گلگون است آخر صیقہ دل ہا
زہیم دردِ ہزن دل نمی بازم ولے ترم
کہ راہم بر زندِ نخت گرو عین منزل ہا
سر مینا و خستم عشق کشاگر قفسِ داری
کہ محنوں می شوند از کہتِ ایں باوہ عاقب ہا
رہم گل شد ہمہ از موجِ خیز اشکِ گلگونم
چساں بیرون رود پائے دل دیوانہ زین گل ہا

بہ عیش بوالہوساں در جہاں چہ کار مرا
کہ دردِ عشق تو کافی ست غمگسار مرا
ز پائے تا سرم از بہرِ جرمِ معنی عشق
بہ زلف یار بہ بندید استوار مرا
بہ چشمِ آں شدہ ام خاکِ تیرہ سرمہ صفت
کہ چشمِ یار گم آورد بکار مرا
کنند نسبتِ چشمِ ترا بہ چشمِ غزال
ازاں خوش است بہ صحراد کوہِ سار مرا

قہر دریا کہ ذات راماند موبہائش صفات راماند
 ہمجو گل کو گلاب دیدستی نفی عاشق ثبات راماند
 تانداری جنبہ ز کعبہ دل قبلہ ات سومنات راماند
 غیبر او ہر جہ در نظر دای ہمہ عزتی ولات راماند
 زندگی کاں بیاد او نبود نزد عارف محلات راماند
 شاد ماں جاں دیدہ اگر پرغش
 نصف جانش زکات راماند

فارسی زبان کی ایک اور نہایت اہم اور قابل ذکر تصنیف کے گوہر نامہ ہے۔ جس کا مصنف ایک ہندو دُئی چند نامی تھا۔ کے گوہر نامہ فارسی زبان کے بعض عظیم مصنفین کے انداز تحریر میں لکھا گیا ہے۔ یعنی زیادہ تر بیان شریں ہے۔ لیکن اس نشر کو باجموزوں اشعار سے مزین کیا گیا ہے۔ دُئی چند ایک لکھڑو وار کے ہاں ملازم تھا۔ اس لئے اُس نے اس کتاب میں اپنے آقا کی خوشنودی مزاج کے لئے لکھڑوں کی مختصر تاریخ قلمبند کی ہے۔ چونکہ بنیادی مقصد یہ تھا کہ اپنے آقا اور اُس کے خاندان کے تعریف کی جائے۔ لہذا اس میں دیئے ہوئے واقعات تاریخی اعتبار سے مستند نہیں۔ لیکن اس لحاظ سے اس کتاب کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں لکھڑوں کے جد امجد شہزادہ کے گوہر سے لے کر تاریخ تحریر تک لکھڑوؤں کا شجرہ نسب اور اُن کی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات درج ہیں۔ لکھڑوں کی سیاسی تاریخ کے علاوہ اس میں اہل پوٹھوہار کے رسم و رواج اور مجلسی زندگی کے متعلق بھی بہت کچھ ملتا ہے۔

دُئی چند گوہر خان کے قدیمی قصبے گلیانہ کا رہنے والا تھا۔ فارسی اور پوٹھوہاری

زبان کا اچھا سلجھا ہوا شاعر تھا۔ اس کی مشہور و معروف تصنیف کے گوہر نامہ اس کے خاندان میں محفوظ رہی لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلاب میں تلف ہو گئی۔ اس وقت اس کتاب کے تین قلمی نسخے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک برٹش میوزیم لندن میں، دوسرا رائل ایشیائیک سوسائٹی کلکتہ کی لائبریری میں اور تیسرا کرنل راجہ محمد گلزار خاں کی ذاتی لائبریری میں ہے۔ راجہ صاحب گکھڑ خاندان کے چشم و چراغ ہیں اور تاریخی تحقیق و تدقیق کے نہایت دلدادہ ہیں۔

اب اس کتاب کا نیا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

پلوٹھوہاری زبان اور ادب

جہاں کہیں دو مختلف قسم کے تمدن رکھنے والی قوموں کو ایک دوسرے کے ساتھ میل جول رکھنا پڑتا ہے ایک نیا تمدن، جس میں ان دونوں تمدنوں کی خصوصیات اور لطافتوں کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ لازماً وجود میں آتا ہے۔ اس طرح دو قوموں کے باہمی ربط و ضبط سے ایک نئی زبان کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ نئی زبان ان دونوں قوموں کی زبانوں کی تار و پود، محاورے اور روزمرے، لب و لہجے اور اسماء و افعال کے آپس میں گھل مل جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نئی زبان کے پیدا ہونے کی اولین شرط یہ ہے کہ دونوں قوموں میں باہمی میل جول کے بندھن بہت گہرے ہو جائیں۔ محض حاکم و محکوم کے تعلق سے نہ تو نیا تمدن اُبھر سکتا ہے نہ نئی زبان وجود میں آ سکتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان پر انگریزوں کا عمل دخل قریباً دو سو سال تک رہا۔ لیکن اس عمل دخل سے نہ تو کوئی مشترکہ قسم کا نیا تمدن اُبھرا۔ نہ ہی کوئی نئی زبان پیدا ہوئی۔ بلکہ اول سے لے کر آخر تک انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان بیگانہ پن اور دو کوئی کا گہرا احساس موجود رہا۔ حالانکہ اس سے پہلے اسی ملک میں مختلف اقوام کی آمد اور عمل دخل

سے نئے تمدن بنتے رہے اور نئی زبانیں ظہور پذیر ہوتی رہیں۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد اور ہندوؤں کے ساتھ ان کے میل جول سے ہندوستان میں اردو زبان نے جنم لیا۔ اردو درحقیقت برج بھاشا اور فارسی زبان کے باہمی امتزاج کا نام ہے۔ برج بھاشا وید زبان تھی جو دہلی اور یوپی کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ باقی تمام ملک میں مختلف پراکرتیں بولی جاتی تھیں۔ پوٹھوہار کے علاقے میں جو پراکرت بولی جاتی تھی اس پر فارسی زبان کے عمل دخل سے پوٹھوہاری زبان وجود میں آئی۔ ہم و فوق سے نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت پوٹھوہار میں کون سی پراکرت بولی جاتی تھی لیکن ظاہر ہے کہ جو پراکرت بھی تھی۔ وہ سنسکرت ہی کی شاخ تھی۔ اس پراکرت میں ثقیل اور ناک سے نکلنے والی اصوات کی کثرت تھی۔ یہ ثقیل اور ناک میں سے نکلنے والی اصوات پوٹھوہاری زبان میں موجود ہیں۔ اردو بولنے والوں کے لئے یہ اصوات نامانوس اور غریب ہیں اور وہ ان کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتے۔ مثلاً بھ اور بھو کی آواز اردو بولنے والے لوگوں کے ہاں اس سے قطعاً مختلف ہے جو پوٹھوہاری بولنے والوں کے ہاں ہے۔ اسی طرح "ن" کی آواز اہل اردو کے ہاں بالکل سادہ سی ہے لیکن اہل پوٹھوہار کے ہاں بعض الفاظ میں ثقیل ہو کر "ن" اور "ڑ" کی ملی جلی سی آواز بن جاتی ہے۔ چنانچہ اردو زبان کے لفظ "کانا" کا اہل پوٹھوہاری زبان میں کانٹراں کی طرح ہو جاتا ہے۔

پوٹھوہاری زبان میں یہ ثقیل اور ناک سے نکلنے والی اصوات سنسکرت زبان سے براہ راست آئی ہیں۔ ان اصوات میں وہ ملائمت اور نرمی پیدا نہیں ہو سکی جو اردو زبان میں جا کر پیدا ہوئی ہے۔ پوٹھوہاری زبان کے بہت سے افعال سنسکرت زبان سے لئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان افعال کی گردانیں فارسی قواعد کے ماتحت کی جاتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پوٹھوہاری زبان

ایسے لوگوں کی زبان ہے جو طبعاً سخت مزاج اور جنگجو طبیعتوں کے واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے اُن کے ہاں لب و لہجہ کی وہ نرمی اور ملائمت نہیں جو دہلی، لکھنؤ اور لاہور جیسے تمدنی مراکز میں رہنے سہنے والے لوگوں کے ہاں ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل پوٹھواری کی زبان و بیان میں غلو، مقصدیت اور بے ساختہ زیادہ ہے، اور تکلف، تصنع اور بناوٹ کم۔ ہم دُلق سے نہیں کہہ سکتے کہ موجودہ پوٹھواری زبان کی تشکیلاتیں و تکنیکیں کس دور میں ہوئی۔ لیکن اتنا تو یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مغلوں کے زمانے تک یہ زبان بیشتر ارتقائی مراحل طے کر چکی تھی۔ اور اس کی ہیئت و ترکیب اُس وقت تک متعین اور قمشکل ہو چکی تھی۔ چنانچہ جہانگیر اپنی توزک میں جس زبان کو گکھڑوں کی زبان کہتا ہے وہ یہی پوٹھواری زبان تھی۔ اُس زمانے کی پوٹھواری زبان اور آجکل کی پوٹھواری زبان صورت اور ہیئت کے اعتبار سے تقریباً بالکل یکساں ہے اور تاریخی شواہد اور پوٹھواری زبان کے ادب کے مطالعہ سے یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ گزشتہ ایک سو سال میں اس کی ہیئت، ترکیب اور ساخت بلکہ مزاج میں بھی بہت کم تغیر و تبدل واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آج سے سو برس پیشتر پوٹھواری کی جو شکل و صورت تھی، آج بھی بعینہ وہی شکل و صورت ہے۔ بلکہ محاورہ اور روزمرہ بھی جو تحولات زمانہ سے لازماً تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ پوٹھواری زبان میں بہت کم اثر پذیر ہوئے ہیں۔

جیسا کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان کی صورت میں ہوتا رہا ہے، پوٹھواری زبان میں شاعری کا آغاز بھی لوک گیتوں اور منظوم پہیلیوں سے ہوا۔ لوک گیت درحقیقت محبت اور نفرت، خوشی اور غم، ملاپ اور جدائی کے جذبات کا اظہار نہایت سادہ اور پُر غلو انداز میں کرتے ہیں۔ ان میں ایسی بحریں اور دھنیں اختیار کی جاتی ہیں جو عوامی طبقات کے لئے قابل قبول اور نہایت سرعت سے تاثر

پیدا کرنے والی ہوں۔ صد ہا سال سے اپنی پوٹھوہاری شادی، بیاہوں، فصلوں، میلوں اور دوسری عوامی تقریبات میں گیت گاتے چلے آئے ہیں۔ ان گیتوں میں جذبات و تاثرات کی بے پناہ شدت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ محبت اور اس میں پیش آنے والے واقعات و حادثات کا اظہار جذباتی کے درد اور ملاپ کی مسترتوں کا بیان بھی انہی لوگ گیتوں کہہ ذریعے کیا جاتا ہے۔ پوٹھوہاری زبان کے مقبول ترین لوگ گیت ”ماہیا“ اور ”ڈھولا“ ہیں۔ اس کے علاوہ کوہستانی علاقوں میں ”چن“ گیت بھی مروج اور مقبول ہے۔ ”ماہیا“ پنجابی زبان کا مقبول ترین لوگ گیت بھی ہے۔ اور پوٹھوہاری زبان میں گائے جانے والے ”ماہیا“ اور پنجابی زبان میں گائے جانے والے ”ماہیا“ کے بہت سے بول شکر بھی ہیں لیکن ”ڈھولا“ پوٹھوہاری زبان کا خاص اپنا لوگ گیت ہے۔ اس گیت میں جو رس، گھلاوٹ، مٹاس اور کسک ہے۔ اس کا اندازہ کچھ دہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے زمانے میں اسے گایا ہو۔ پوٹھوہار کا شاید ہی کوئی جوان ہوگا جسے ”ماہیا“ اور ڈھولا کے کچھ بول نہ آتے ہوں۔ آج کل بھی جبکہ شہری معاشرے میں پلے ہوئے نوجوان فلمی گانوں کے رسیا نظر آتے ہیں۔ اپنی دیہات اپنے قدیم لوگ گیتوں کی دھنوں میں مست دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگ گیتوں میں وقت اور عصری حالات کے مطابق تغیر و تبدل بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن اس تغیر و تبدل پر کسی شاعر کے نام کی چھاپ نہیں ہوتی۔ لوگ گیتوں کی امتیازی خصوصیت یہاں یہ ہے کہ ان کی تخلیق کسی فرد واحد کی کوششوں کی مرہون منت نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک ایسا ادبی سرمایہ ہوتا ہے جو معاشرے کے بہت سے افراد کی مشترکہ کوششوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

پوٹھوہاری شاعری کی ہیئت اور مواد میں جو تغیرات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ انہیں قدر نظر رکھتے ہوئے ہم یہ سہولت اسے تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ ابتدائی دور

۳۔ دورِ جدید

اہم ترین دور کا عرصہ انیسویں صدی کے تقریباً وسط سے لے کر اس کے اختتام تک ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندی مسلمان سیاست اور مجلسی زوال کی انتہائی پستیوں تک جا پہنچے تھے۔ اور تقدیر کی ضرب لائے پے بہ پے سے پڑے کراہ رہے تھے غم و غصہ کی ایک شدید لہر نے انہیں اپنی گرفت میں لے رکھا تھا اور زندگی کے متعلق ان کے نظریات تختہ اور قنوطیت سے ملبو تھے۔ قوی زندگی کے اس المناک موڑ پر انہوں نے اپنے آباء اجداد کی طرح جنہوں نے ایران اور عراق پر تنگولوں کے تسلط کے بعد آغوشِ تصوف میں پناہ لی تھی۔ یہ مناسب سمجھا کہ عجمی تصوف کے سایہ عاطفت میں سکونِ قلب کی تلاش کی جائے۔ اس زمانے میں پوٹھواری شاعری ابھی عالمِ طفولیت میں تھی۔ اس لئے خطہ پوٹھواری کے ان لوگوں نے جن کے دلوں میں شاعری کی چنگاری موجود تھی۔ متصوفانہ نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ اور مددِ عانت اور عشقِ حقیقی کے جذبات سے اپنے اشعار کو آراستہ کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں پوٹھواری زبان کے چار شاعر میاں محمد بخش، میاں الہی بخش، ملک پلو اور شاہ شرف بڑے نمایاں ہیں۔ میاں الہی بخش نے سستی پتوں کی مشہور و معروف عشقیہ داستان صوفیانہ رمز و ایما کے لباس میں لکھی۔ اس داستان کو بعد میں کئی دوسرے شعرا نے بھی نظم کی صورت میں پیش کیا۔ پلو نے مرزا صاحبان کی داستان کو لباسِ شعر میں آراستہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ پلو کی مرزا صاحبان قدیم ترین ہے اور بعد میں جتنے شعرا نے مرزا صاحبان کی داستان نظم کی، ان سب نے کم و بیش پلو کی نظم سے استفادہ کیا۔ لیکن پلو کی یہ نظم آج بالکل نامید ہے۔

پلو پکوال کے ایک گاؤں مہرو پلو کا رہنے والا تھا۔ اس گاؤں کی بنیاد

رکھنے والا وہ خود تھا اس لئے اسی کے نام سے گاؤں مشہور ہوا۔ وہ درویش نش
السان تھا اور ہمیشہ سیر و سیاحت میں مصروف رہتا تھا۔ سیر و سیاحت کی وجہ سے
اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ اس کے اشعار زبانِ زورِ عام و خاص
ہو گئے اور آج تک دیہات کے لوگ انہیں اپنی محفلوں میں بڑے ذوق و شوق سے
پڑھتے ہیں۔ ان اشعار میں جذب و مستی کی بھرپور کیفیت ہے۔ حسن و عشق کے
رموز و اسرار ہیں اور روزمرہ کی دانش مندانہ باتیں بھی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

جس رکھ داجھل کھائیے، شک جائے تے اُس نوں ساڑیے نہیں
جہنوں یار کہیے اُس دے نال رہیے ٹر جائے تے اُس نوں دساریے نہیں
جہڑا قول زبان توں کہہ دیتے مَر جائیے تے اُس نوں ہاریے نہیں
پلو غم کھانا کم اے عاشقاں دا، نہیں تے عاشقی وچہ دم ماریے نہیں
بعض لوگ اس روایت پر یقین رکھتے ہیں کہ پلو سلطان محمود غزنوی کا
محاصرہ تھا۔ یہ روایت واقعاتی شہادتوں کے صریحاً خلاف ہے۔ پلو کی زبان اس
بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اُس کا زمانہ حیات بالکل قریب ہی ہے اور کسی صورت
میں بھی ڈیڑھ سو برس سے زیادہ پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اشعار کی داخلی
شہادت بھی اس بات کا نہایت مکمل ثبوت بہم پہنچاتی ہے۔ مثلاً اُس کے مندرجہ
ذیل اشعار کو دیکھئے۔

جیوندیاں نوں کیوں مارنا ایں جیکر مویاں نوں نہیں جو ان جوگا
مالی سوالی نوں کیوں پیا گھورنا ایں جے خیر نہیں ہتھیں پان جوگا
وسدے گھراں نوں کیوں اُجاڑنا ایں جیکر اُجڑے نہیں وسان جوگا
پلو بربیاں نوں رکھ جیل خانے جیکر نیکیاں نہیں کمان جوگا
یہ اشعار اُس زمانے کے ہیں جب انگریز سرزمینِ پاک و مہند میں

اپنے قدم چارہے تھے۔ اور اس ملک کے رہنے والوں پر اُن کے ہاتھوں عرصہ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ آخری مصرع میں جیل خانے کا لفظ ان اشعار اور ان کے لکھنے والے شاعر کے زمانے کا واضح طور پر اعلان کر رہا ہے۔

میاں الہی بخش بھی ضلع جہلم کی تحصیل پنڈ دادن خان کے رہنے والے تھے، اس لئے ان دونوں شاعروں کے کلام میں مقامی محاورے کا اثر دھنی روپ کو نمایاں کر رہا ہے۔ شاہ شرف بھی اسی ضلع کے رہنے والے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اپنے زمانے کے بالکمال شاعر تھے۔

میاں محمد بخش ضلع جہلم کے انتہائی شمالی حصے کے قریب رہنے والے تھے۔ یہ علاقہ ریاست جٹوں میں شامل ہے۔ میاں صاحب ایک محترم درویش گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسی خاندان کے سجادہ نشین تھے جو مرجع خلافت تھے تصوف اور درویشی انہیں خاندانی ورثے میں ملی تھی۔ اور انہوں نے اپنی ذاتی لگن، ریاضت و عبادت اور فقر و سلوک سے شغف کی بدولت اس خاندانی ورثے میں پیش بہا اضافہ کیا۔ فقر و درویشی میں زندگی بسر کرنے والے شاعر کے ہاں روحانیت اور تصوف کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے پوٹھوہاری زبان کی مشہور و معروف عشقہ مننوی ”سفر العشق“ المعروف ”سیف الملوک“ لکھی۔ یہ مننوی ہمارے ادب میں وہی مقام رکھتی ہے جو فارسی ادب میں شیخ فرید الدین عطار کی مشہور و معروف متصوفانہ مننوی ”منطق الطیر“ کو حاصل ہے۔ اس میں تصوف کے مقامات کا تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اور عشق مجازی کے پیرائے میں درحقیقت عشق حقیقی کی تمام منازل سے سالکان راہ طریقت کو آگاہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں:

بات حقیقی رمز مجازی دن و ناندی کا مٹی

سفر العشق کتاب بنائی سیف چھپی وچہ لا مٹی

سیف الملوک پوٹھوہاری شاعری میں کلاسیکی مقام حاصل کر چکی ہے۔ یہ طویل نظمیں زبان و بیان کا ایک شاہکار ہے۔ اس میں وہ تمام ادبی محاسن موجود ہیں۔ جو ایک عظیم الشان کلاسیکی رزمیہ داستان میں ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج تک لاکھوں کی تعداد میں پھپ کر فروخت ہو چکی ہے۔ جہلم، ہزارہ، راولپنڈی اور آزاد کشمیر کے علاقوں میں شاید ہی کوئی گاؤں ایسا ہو گا۔ جس میں "سیف الملوک" کے چند نسخے موجود نہ ہوں۔ لوگ اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ دیہات میں رات کے وقت اسے پڑھنے کے لئے باتا عہ محفلیں جمتی ہیں اس کے اکثر اشعار ضرب الامثال کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ جنہیں لوگ بوقت ضرورت اپنی گفتگو میں بے تکلفانہ استعمال کرتے ہیں۔

نیچاں دی اثنائی کولوں پھل کسے نہیں پایا

ککرتے انگور چٹھایا ہر خوشہ زخمایا

اس مثنوی کے موضوعات کو شاعر نے جس فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے وہ

ملاحظہ کرنے کے قابل ہے۔

روح شہزادہ شاہ مہر نے نہیں صدق محبت بھائی

جرم ہوا ذمی دی بگلہ تن توں جگہ بنائی

آز جرم و شیر کلاں دے قفل دراں بدختی

ملکہ قاتوں ایہہ دل ستا شہوت جادو تختی

نفس اسا ڈا دیو میرا غفلت ندہ ڈو ہنگیری

جہل صندوق ہوئے دوپکے گنجی ام چنگیزی

پنچھی پنچریاں دہر حساں پنچ باطن پنچ ظاہر

باغ ارم ذل و انگوں سمجھو نکل سوئے نہ باہر

ثانوی دور میں پونٹو ہاری شاعری کا رخ روحانی عشق و محبت سے جسمانی عشق و محبت کی طرف پھیر گیا۔ گویا شاعر لاہوت سے ناسوت میں اور حقیقت سے مجاز تک آ پہنچا۔ اس دور میں میاں محمد بخش جیسا عظیم کلاسیکی شاعر تو کوئی نہ آجھرا لیکن ایسے شعراء ضرور پیدا ہوئے جنہیں زندگی کی تلخیز، اور محبت کی ناکامیوں کا نسیم اب پینا پٹا۔ چنانچہ ان شعراء کے ہاں ہمیں دکھ، درد، حسرت، ناکامی، دو سیتوں کی کچ ادائی اور اہل دنیا کی بے وفائی کے مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ اس دور کے دو شاعر برحق اور سائیں نہایت ممتاز اور سرباوردہ ہیں۔ برحق کو اپنی زندگی میں بہت زیادہ دکھوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُسے نہ صرف محبوب کی بے وفائی کا شکوہ ہے بلکہ عزیز واقارب کی دشمنی کی شکایت بھی ہے۔ اُس کے محبوب نے تو صرف اُس کی محبت کو ٹھکرا کر اُس کے دل کو مجروح کیا تھا۔ لیکن اعزہ نے اُسے قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر کے اُس کے زخم خوردہ دل کو پاش پاش کر دیا۔ چنانچہ اُس کے اشعار میں غم اور غصے کی ایک نہایت تند و تیز لہر رواں دواں نظر آتی ہے، اس کا انداز بیان تیکھا اور نشتر کی طرح دلیں لگنے والا ہے۔ تاہم چونکہ اُس کی شاعری زیادہ تر غم ذات کے محو کے گرد گھومتی ہے، اس لئے اس میں اثر انگیزی اور اثر آفرینی کے باوجود وہ آفاقیت نہیں جو فنکار کو فن کی عظیم رفعتوں پر لے جاتی ہے۔ چنانچہ اُس کا نقطہ نظر محدود اور ذہنی اُفق تنگ ہے۔ اس کے مقابلے میں سائیں کا ذہنی افق وسیع تر ہے۔ اس لئے اس کے کلام میں آفاقیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ فن کے اعتبار سے بھی سائیں، برحق کے مقابلے میں زیادہ کچھ اور گہیر ہے۔ اس کا انداز بیان زیادہ نکھرا ہوا اور اُس کے تخلیقی نقوش زیادہ واضح اور روشن ہیں۔ اگرچہ وہ لوگوں کے قول کے مطابق آئی محض تھا لیکن زبان و بیان پر حیرت انگیز قدرت رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے محاسن شعری پر پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اُس کی تشبیہیں مکمل اور استعارے پُر لطف ہیں۔ وہ فارسی اور

اُردو تراکیب کا نہایت ہنرمندی اور خوبصورتی سے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ ایک عام قاری کو یہ بات ماننے میں تامل ہونے لگتا ہے کہ یہ شخص تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھا۔

بیسویں صدی کے رُبحِ اوّل میں راولپنڈی پوٹھوہاری شاعری کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ برہاد تو انیسویں صدی کے اواخر ہی میں وفات پا گیا تھا۔ لیکن سائیں بیسویں صدی کے رُبحِ اوّل میں زندہ تھا اور شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا اس اثنائے برہاد اور سائیں کے علاوہ کئی دوسرے شعراء بھی چلک اُٹھے تھے۔ جن میں سے جوہر، چنگی اور ہمسر خاص طور پر مشہور تھے۔ جوہر سائیں کا حریف تھا اور چنگی اس کا شاگرد خاص تھا۔ ہمسر سائیں کا شاگرد تھا۔ ان شعراء کی بدولت عوام میں بھی شعرو سخن کا ذوق بیدار ہوا۔ کچھ رو سائے شہر نے شعراء کی سرپرستی شروع کر دی۔ جن سے ذوقِ سخن کو اور ترقی ہوئی۔ شہر میں پوٹھوہاری زبان کے باقاعدہ شاعر ہونے لگے۔ سائیں اور جوہر ان مشاعروں کی جان ہوا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ دونوں شاعروں کے بے شمار تلامذہ پیدا ہو گئے جو ان مشاعروں میں شریک ہو کر ان کا کلام سنتے اور داد دیا کرتے تھے۔ اُستادوں کے ساتھ شاگرد بھی ان مشاعروں میں خوب لنگر لنگوٹے کس کرتے تھے اور اپنے اپنے اُستاد کی لاج رکھنے کے لئے اپنے کلام کی نوک پلک پوری طرح دُرست کر کے ہمراہ لاتے تھے۔

ہئیت کے اعتبار سے اُس دور میں پوٹھوہاری شاعری صرف ”ہئیت“ اور ”ہسی حرفی“ تک محدود رہی۔ ہر شاعر نہایت پابندی اور خلوص سے اسی ہئیت کے اندر رہ کر فکرِ سخن کرتا تھا۔ کسی شاعر نے ہئیت میں کسی قسم کے اجتہاد کی کوشش نہ کی۔ لیکن ان شعراء سے کسی قسم کے فنی اجتہاد کی بھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ اُن کی تعلیم واجبی تھی اور انہیں کسی قسم کا اعلیٰ علمی ماحول یا پس منظر نصیب نہ تھا۔ یہی غنیمت تھا کہ انہوں نے شعرو سخن

کی شمع کو روشن اور ذوقِ شاعری کو زندہ رکھا اور انہی کے توسط سے پوٹھوہاری شاعری قدم بڑھاتی ہوئی اس دور تک آپہنچی۔ جسے ہم دورِ جدید کہتے ہیں۔

لیکن دورِ جدید میں قدم رکھنے سے پہلے پوٹھوہاری شاعری پر ایک مختصر سا زمانہ ایسا بھی آپا جسے جو دو قحط کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ زمانہ تقریباً ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کا ہے۔ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے یہ زمانہ عظیم ملی اور قومی تحریکوں کا زمانہ تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں سیاسی ہوں یا اخلاقی، تمدنی ہوں یا ثقافتی، ادبی ہوں یا لسانی، تمام مسائل کو قومی نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ہر معاملے میں قوم و ملت کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں ہندوستان میں مسلم قومیت کی بڑی تند و تیز لہر اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مسلمانوں کے قلوب و اذان پر بھاگتی۔ ہندوستان میں مسلم لیگ جگمگا کر مسلم قومیت کے نظریے کی عطاوار بنتی۔ چنانچہ اس نے جہاں مسلمانوں کی اجتماعی سیاسی زندگی کو منظم اور متحد کیا۔ وہاں ایک علیحدہ قومی زبان کے مسئلے پر بھی تمام مسلمانوں کو متفق کر لیا۔ اردو زبان اس جگمگانے قومیت کے نظریے کی علامت قرار دے دی گئی۔ چنانچہ اردو پڑھنے، اردو لکھنے اور اردو بولنے کی تحریک اس شد و مد سے چلی کہ اردو کے علاوہ کسی علاقائی زبان کا لکھنا پڑھنا اور بولنا مسلمانوں کے لئے شجرِ ممنوعہ کی صورت اختیار کر گیا۔ مسلمانوں نے اردو اور صرف اردو کی خدمت گزاری اور اسی کی ترقی کے لئے تمام وسائل کو بروئے کار لانے کو ایک قومی فریضہ سمجھ کر اختیار کیا۔ چنانچہ اس دور میں علاقائی زبانیں بالکل نظر انداز کر دی گئیں۔ پنجابی زبان بھی جس کی وسعت اور دائرہ اثر کہیں زیادہ تھا۔ اور جس کی ادبی تحریکیں پوٹھوہاری زبان کی ادبی تحریکوں سے کہیں زیادہ منظم تھیں۔ اس زمانے کی ملی تحریکات کی چوٹ سہ نہ سکی اور کچھ عرصہ کے لئے بالکل نڈھال اور گم سم ہو کر رہ گئی۔ پوٹھوہاری زبان کا ادبی سرمایہ اتنا وسیع

اور وقیح نہ تھا، نہ ہی اس کی ادبی تحریک میں اتنی تنظیم اور استحکام تھا اس لئے قدرتی طور پر پوٹھوہاری ادب پر جمود اور سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ چنانچہ یہ دور پوٹھوہاری ادب کے مٹھاؤ اور تعطل کا دور ہے۔ اس دور میں کسی گراں قدر ادبی تصنیف کا تذکرہ ہی کیا، کسی قابل ذکر نظم یا سہ حرفی کا اضافہ بھی نہیں ہوا۔

ادبی تحریک کے علاوہ ایک اور چیز اس جمود اور سکوت کا بڑا سبب بن گئی۔ یہ چیز اس علاقے میں تعلیم کی ترقی تھی۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ تعلیم کی ترقی ادب کے مٹھاؤ اور جمود کا سبب بن جائے لیکن چونکہ تعلیم کی ترقی سے لوگ انگریزی، اردو، فارسی، عربی زبان کے ادب سے زیادہ قریب ہو گئے۔ اور ان بڑی زبانوں کا ادب بہر حال پوٹھوہاری زبان کے شعروادب سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ ان زبانوں کے ادب سے زیادہ مشغوف و مخطوط ہونے لگا۔ پوٹھوہاری شاعری میں ہلتی تھی۔ لہذا قدرتی طور پر لوگوں کا میلان طبع پوٹھوہاری شعروادب کی طرف سے ہٹ گیا۔ جب لوگوں کا میلان طبع اس طرف نہ رہا تو ظاہر ہے کہ شعراء اور ادباء بھی پوٹھوہاری زبان میں شعروادب کی تخلیق کو محض تفسیح اوقات سمجھنے لگے۔

قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کی اندھا دھند حمایت اور علاقائی زبانوں کی بے جا مخالفت کے خیالات کا زور کم ہونا شروع ہوا۔ تعصبات کی وہ آندھی جس نے تمام لوگوں کے ذہنوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، رفتہ رفتہ پھٹنے لگی آنکھوں پر سے بے جا حمایت و مخالفت کے حجابات اٹھنے لگے۔ اور رفتہ رفتہ لوگ حالات کے صحیح خدوخال کو دیکھنے لگے۔ ہمارے علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ہر چند کہ ہماری علاقائی شاعری میں وہ نزاکت

لے وہ نفاست نکتہ آفرینی اور نازک خیالی کہاں تھی جو ان زبانوں کی شاعری میں تھی۔

خیال اور نفاست بیان نہیں جو دنیا کی عظیم زبانوں کی شاعری میں ہے۔ تاہم اس میں وہ تمام عناصر اور عوامل بخوبی موجود ہیں جو ہمارے قلب و نظر کے لئے کشش کا باعث ہو سکتے ہیں اور جن کی وجہ سے ہمیں اپنی زبان کے شعروادب میں پوری پوری اپنائیت اور یگانگت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تو اردو، انگریزی اور عربی، فارسی شاعری اور ادب سے خط امٹھاتا ہے۔ لیکن عوام جن کی اکثریت ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ ہے۔ اپنی زبان کے ادب کے بغیر کسی دوسری زبان کے ادب سے محفوظ نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا اہم اور مقدس فریضہ یہ بھی ہے کہ قدرت نے احساس و ادراک کی جو دولت انہیں عطا کی ہے۔ اس سے عوام الناس کو بھی مستفیض کریں۔ جو روشنی ان کے ذہنوں میں ہے اسے ان لوگوں کے ذہن کے گوشوں تک بھی پہنچائیں جنہیں مبدع ازل نے اس نعمت سے محروم رکھا ہے۔

موجودہ دور جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، خیالات و مدرکات کی نشر و اشاعت اور جذبات و محسوسات کے باہمی نفوذ و امتزاج کا دور ہے۔ اس دور میں ہر زبان کے اعلیٰ اور ارفع ادبی خیالات اور جذبات میں اتنی الفت ہوئی چاہیے کہ دوسری زبانوں کے جذبات اور خیالات کو اپنے اندر جذب کر سکے۔ پوچھو ہمارے رہنے والے شاعروں اور ادیبوں نے بھی دورِ جدید کے ان تقاضوں کو پوری طرح سمجھ لیا اور اردو، انگریزی اور فارسی زبان کے اعلیٰ اور ارفع جذبات کو اپنی مقامی زبان کے ادب میں منتقل کرنے کی مہم شروع کی۔ بیسویں صدی کے آغاز سے جہاں سائنس اور ادب کی روشنی نہایت تیزی سے پھیلنا شروع ہوئی۔ وہاں اس صدی میں لڑی جانے والی دو عظیم جنگوں نے

دنیا کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے سے نہایت قریب بھی کر دیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہمارے علاقے کے کئی اہل قلم وردی پن کر ملک ملک اور دلیں دلیں میں گھومتے پھرے۔ اس طرح گھومنے پھرنے سے ان کے قلوب واذہان میں زیادہ سے زیادہ روشنی اور جلا پیدا ہوئی۔ جب یہ سپاہیِ حبیب جنگ کے خاتمے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹے تو انہوں نے اس جلا اور روشنی سے تمام اہل ملک کے دل و دماغ کو متور کرنا شروع کیا۔ ملی تحریکات اور تعلیم کی توسیع نے خطہ پوٹھوہار میں بھی ہر طرف اردو ادب کی مشعلیں فروزاں کر دی تھیں۔ چنانچہ اس علاقے میں بھی کئی صاحبِ کمال شاعر و ادیب آفاق ادب پر نمودار ہوئے۔ اردو، انگریزی اور فارسی زبان کے ادب سے گہرا لگاؤ ہونے کی وجہ سے ان ادباء اور شعراء کی ذہنی سطح اپنے پیشروؤں سے بہت بلند تھی۔ جب ان لوگوں نے اردو ادب کے ساتھ ساتھ پوٹھوہار ادب کی طرف بھی توجہ کی تو ہر طرف خیالات و جذبات کے چمنستان کھل اُٹھے۔ ان شعراء اور ادباء نے جب قدیم اور جدید ادب کو کھنگالنا شروع کیا تو انہیں ایک بیک یہ احساس ہوا کہ وہ اپنی مادری اور علاقائی زبان سے نہایت تغافل پسندانہ بلکہ نامنصفانہ سلوک کے مرتکب ہوتے رہے۔ انہیں اب محسوس ہوا کہ پوٹھوہاری زبان کی طویل نظم ”سیف الملوک“ ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جسے دنیا کی کسی زبان کے مقابل نہایت فخر سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم کے گہرے مطالعہ سے انہیں اندازہ ہوا کہ زبان و بیان، تشبیہ و استعارہ، نازک خیالی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے یہ نظم کسی طرح بھی کسی زبان کے ادبی شاہکار سے کم نہیں، ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں بلکہ خود اردو زبان میں ربط و تیسلسل اور متصنوفانہ اور فلسفیانہ انداز بیان کے لحاظ سے اس پائے کی کوئی کتاب موجود نہیں۔ جس طرح کا جوش

بیان اور زورِ سخن اس طویل مثنوی میں ملتا ہے۔ ایسا کہیں اور بہت کم پایا جاتا ہے۔ دورِ جدید کے ان ادباء اور شعراء نے جب برقا، سائیں، اور دوسرے شعراء کے بیتیوں اور سہ حرفیوں کا مطالعہ کیا تو انہیں نہ صرف ان کی قدرتِ کلام اور قدرتِ بیان کا اندازہ ہوا۔ بلکہ یہ جان کر حیرت بھی ہوئی کہ یہ لوگ جو علوم ظاہری سے بہت کم بہرہ یاب ہوئے۔ قسامِ ازل سے کیا طبیعتیں اور کیسی بصیرتیں لے کر آئے تھے کہ ان کا ایک ایک شعر فطرتِ انسانی کے کئی گہرے اور تہہ در تہہ اسرار و رموز پر سے پردہ ہٹا دیتا ہے۔ ان کے شعری اصنام جو بیتیوں اور سہ حرفیوں کے نہایت سادہ اور کھردرے لباس میں ملبوس ہیں۔ کتنی فنی مہارت سے تراشے گئے ہیں۔ ان کے کلام میں کتنا رس، جاذبیت، جوش اور حرارت ہے۔ ان کی شاعری میں کتنی جان اور زندگی ہے کہ ایک ایک شعر کی دھڑکن سے ہزاروں دل دھڑکنے اور سیکڑوں ذہن گمانے لگتے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں راولپنڈی میں ریڈیو سٹیشن نصب ہوا۔ جدید پوٹھوہاری ادب کی تاریخ میں یہ تنصیب ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ریڈیو سٹیشن کے قیام نے پوٹھوہاری شاعری کے مٹھڑے ہوئے جسم میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑادی۔ یہ درست ہے کہ شاعر طبع تو روزِ ازل سے لے کر آتا ہے لیکن جولائی طبع کے لئے مناسب اور سازگار ماحول کا ہونا ضروری ہے نئے زمانے میں چونکہ لوگوں کو تفریح طبع کے کئی جدید اور رنگین وسائل میسر آ گئے ہیں۔ لہذا پوٹھوہاری زبان کی قدیم شاعرانہ محفلیں جہاں شعراء آ کر بیت اور سہ حرفیاں سنایا کرتے تھے متروک ہو چکی تھیں۔ البتہ اب اردو شعروادب کی محفلیں منعقد ہونے لگی تھیں لیکن ان محفلوں میں وہی لوگ شریک ہو کر محفوظ ہو سکتے تھے جو تعلیم اور ذوق سے بہرہ ور تھے۔ ان حالات میں ریڈیو سے پوٹھوہاری

زبان کے شریوں نے جلد ہی ان قدیم محفلوں کی جگہ حاصل کر لی جہاں ناخواندہ یا نیم خواندہ لوگ شعر و ادب سے محفوظ ہوتے تھے۔ خطہ پوٹھوہار کے جدید شعراء جو اپنی علاقائی زبان کے شعر و ادب کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ ان شریوں کی بدولت پوٹھوہاری زبان میں شعر کہنے اور نثری ادب پارے لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ اور اس طرح پوٹھوہاری شاعری کا احیاء اور نئے نثری دور کا آغاز ہوا۔

پوٹھوہار کے جدید شعراء اور ادیب اکثر و بیشتر زیر تعلیم سے آراستہ اور اردو فارسی اور انگریزی ادب پر گہری نظر رکھنے والے ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس علاقے کے لوگوں کو فارسی زبان اور ادب سے ہمیشہ گہرا شغف رہا ہے۔ اردو ملی زبان ہونے کی حیثیت سے اس علاقے کے لوگوں میں ویسی ہی مقبول ہے۔ جیسی پاکستان کے کسی اور خطے میں پوٹھوہاری زبان میں لکھنے والے جدید شعراء میں سے زیادہ تر اردو زبان کے معروف شاعر ہیں۔ ان شعراء نے اپنے وسیع مطالعہ اور بلند ذہنی آفاق کی بدولت پوٹھوہاری شاعری کے دامن کو بھی رنگارنگ مہلولوں سے ملا مال کر دیا۔ قدیم پوٹھوہاری شاعری میں یا تو لوک گیت پائے جاتے تھے یا مثنوی کی طرح پر نظم لکھی جاتی تھی یا ایک مخصوص بحر اور وزن میں سرغیاں اور بیت لکھے جاتے تھے۔ اس زمانے کے شعراء نے اسلوب، ہیئت اور طرز نگارش میں کوئی اجتہاد نہ کیا۔ اور محض اپنے پیش رو شعراء کے انداز میں بیت اور سرغیاں لکھنے پر اکتفا کرتے رہے۔ جدید شعراء شاعری کی مختلف اصناف پر عبور رکھتے تھے اس لئے انہوں نے پوٹھوہاری زبان میں اردو اور فارسی زبان کی مروجہ اصناف کے تجربات شروع کئے۔ گیت جو ابتداً ہندی شاعری کی ایک خاص اور مقبول صنف تھی اور اس صدی کے آغاز میں حنیفہ جالندھری اور دوسرے شعراء نے اسے اردو زبان میں مروج کیا تھا۔ ان جدید شعراء کی بدولت پوٹھوہاری شاعری میں داخل

۱۔ پوٹھوہاری پروگرام باقی صدیقی نے شروع کیا تھا۔ اب اختر امام رضوی، شریف شاد، الطاف پرواز اور اختر تیرا
اسے نئی جہتیں اور نئے نئے افق عطا کر رہے ہیں۔

ہوئی۔ قدیم پوٹھوہاری شاعری میں گیت کی طرز کی چیز صرف "ماہیا" اور "ڈھولا" تھی۔ لیکن ربط بیان اور تسلسل مضمون جو گیت کی نہایت اہم خصوصیات ہیں۔ "ماہیا" اور "ڈھولا" میں نالہ و تھیں۔ جدید پوٹھوہاری شعرا نے جس گیت سے پوٹھوہاری شاعری کو روشناس کیا ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیتیں سمیرا پر انداز میں موجود ہیں۔ جو ہندی اور ہردو گیتوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایک امر اتفاقی یہ بھی ہے کہ پوٹھوہاری زبان میں وہ لوچ، رس اور بلاغت پوری طرح موجود ہے، جو گیت لکھنے کے فن کو بام عروج پر پہنچانے کے لئے ضروری ہے مثلاً:-

ہسٹیاں، وسٹیاں، رسٹیاں اکھیاں اُجڑ گئیاں
ہن نشیں مینڈھے دسٹیاں اکھیاں اُجڑ گئیاں

ڈونگھے دل دریا نیاں تارو

آپے روگ تے آپے دارو

جاگنیاں، سون تے سونیاں جاگن

زونیاں زونیاں ہسٹیاں..... اکھیاں اُجڑ گئیاں

ہسٹیاں، وسٹیاں، رسٹیاں اکھیاں اُجڑ گئیاں

چن وچڑ گیا من اُجڑ گیا ہویاں سونیاں گلیاں پیار نیاں

آؤ نکھیو پیار یو سار یونی کرو گللاں کچھ دل دار نیاں

پیا پھیر جیہا تقدیراں ناں

دس چلنا نشیں تہیراں ناں

اساں بھولیاں بے تقصیراں ناں

کتیا عشق میں مال فیراں ناں

گلاں وانگ سودایاں کرنی آن کرے آڑیاں کرے پار نیاں

چن وچڑ گیا من اُجڑ گیا ہویاں سونیاں گلیاں پیار نیاں

ٹانویں ٹانویں تارے

چپ چپ چپ تارے

چار چو فیری ہنیرا

لوڑاں فزریاں

تکے تہاڑے لارے

ٹانویں ٹانویں تارے

قدیم پوٹھوہاری شاعری میں موضوعی نظموں کا فقدان تھا۔ بلکہ نظم کی صنف جیسا کہ اردو اور دوسری زبانوں میں مروج ہے بالکل ناپید تھی۔ دورِ جدید کے شعرا نے اس کمی کو بھی بطریق احسن پورا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدید میں جیسی جیسی رنگینیاں اور بولچونیاں ہیں ویسے ہی اس دور کے مسائل بھی گوناگوں ہیں۔ ان مسائل میں ایسے پیچ بہ پیچ اور خم بہ خم الجھاؤ ہیں کہ ان کے بیان کے لئے بھی ہزار شبوہ سخن سرائی کی ضرورت ہے۔ جدید عصری تقاضے شاعر سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ محض سخن و عشق کے بیان اور نصیحت، انسانی کی نقاب کشائی تک اپنے آپ کو محدود نہ کر لے بلکہ ان شریکِ دیدہ اور الجھے ہوئے مسائلِ حیات سے عہدہ برآ بھی ہو، جن کا روپ ہر لحظہ اور ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل سے کما حقہ عہدہ برآ ہونے کے لئے لازمی ہے کہ اُسے موضوعاتی نظم کہنے پر پوری طرح دسترس ہو۔ قیامِ پاکستان کے بعد وطن اور مسائلِ وطن بھی شعرا کی تمام تر توجہ کے طلبگار ہیں۔ حب الوطنی کے جذبات میں خطہ پوٹھوہار کے شعراء ملک کے دوسرے علاقوں کے شعراء سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ چنانچہ گزشتہ دہائی بار برس میں پوٹھوہاری شعرا نے وطن اور حبِ وطن کے موضوع پر نہایت جاندار اور جذبات سے بھرپور نظمیں کہی ہیں۔

گیت اور نظم سے گزر کر ہم غزل کی طرف آتے ہیں جو فارسی اور اردو

شاعری کی محبوب ترین صنف ہے۔ اس سے پہلے پوٹھوہاری شاعری غزل سے
 نا آشنا تھے محض تھی۔ جدید شعرا نے پوٹھوہاری شاعری میں غزل کا اضافہ کر کے
 اس شاعری کے دھارے کا رخ موڑ دیا ہے۔ انہوں نے طویل اور مختصر بحر میں اسی
 انداز میں غزل گوئی کا آغاز کیا ہے جس انداز میں اردو زبان میں غزل بنتی ہے ابھی
 تک پوٹھوہاری غزل کا سرمایہ نہایت مختصر اور محدود ہے۔ لیکن اس کی آسمان سے اندازہ
 ہوتا ہے کہ آگے چل کر اس میں وہی کمال خوبی اور شان محبوبی پیدا ہو جائے گی، جو اس وقت
 اردو غزل میں ہے۔ پوٹھوہاری زبان کی غزل میں رچاؤ اور گھلاوٹ کا اندازہ ذیل کے چند
 اشعار سے ہو سکے گا۔

اُوہ غم دینا نہیں کیہہ سمجھن جہڑے درد فراق نہیں سہہ گئے نہیں
 کچھ اکھیاں دے نال سن گئے نہیں کچھ ہنواں دے نال کہہ گئے نہیں
 اُوہ اپنیاں دچہ دی بیگانے اُوہ دلیساں دچہ دی پردیسی،
 جہڑے تیرے درتوں کئی داری آٹھ تے آٹھ کے بہ گئے نہیں
 جے ذات عشق دی پچھناں، آپچھ سستی دی گورکنوں
 اُوہ پیر مھلاں دچہ جاہنچے جہڑے دچہ مھلاں پہنہ گئے نہیں

دل تیرے پیار دا سوالی اے

دل دی ہر آرزو نرالی اے

دیکھئے کس طرحان لہر ہو دے

رات کالی تے جام خالی اے

شیخ نہیں دیر تک دفنا کیتی

اُوہ غانی دی بھنے والی اے

عشق داروگ سی اسال نوں خیر
ہور دینا کیہڑی سکھالی اے
آس دل دی نہ ویکھ توڑیں سجن
میں بڑی سذغراں نال پالی اے

پوٹھوہاری زبان کے دورِ جدید کے شعراء میں باقی صدیقی، کرم حیدری، افضل
پردیز، طارق مسعود، صادق نسیم، اختر امام رضوی، مستعد احمد اور باغ حسین کمالی
خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے طارق مسعود کے سوا باقی سب اردو کے معروف
شعراء میں سے ہیں بلکہ بنیادی طور پر وہ اردو ہی کے شاعر ہیں۔ جہلم کے اللہ دتہ جوگی
اس علاقہ کے ممتاز شاعر ہیں لیکن ان کی زبان نہایت عمدہ پنجابی ہے۔ شاعروں میں وہ
اپنے کلام اور اپنی پاٹ دار آواز سے سماں باندھ دیتے ہیں چکوال کے ماحبہ صدیقی
بھی بنیادی طور پر اردو کے شاعر ہیں۔ لیکن پنجابی میں بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔
پنجابی میں ان کے دو چھوٹے چھوٹے محبوبے شائع ہو چکے ہیں۔

حال ہی میں ماحبہ صدیقی کا پنجابی کلام ”میں کہتے پانی وہ چہ آں“ ایک اوسط درجہ کی
ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہو کر اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔
راولپنڈی کے احمد ظفر پنجابی شاعری میں بلند مقام رکھتے ہیں
ان کی ایک کتاب ”بیلے بیلے“ کے نام سے چھپ چکی ہے۔ باقی صدیقی کے
پوٹھوہاری کلام کا مجموعہ ”کچے گھڑے“ کے نام سے شائع ہوا ہے۔ نثار ناسک
اور غلام رسول طارق بھی پنجابی میں نہایت اچھی شاعری کرتے ہیں۔ رشیدہ سلیم سمیں
اردو کے علاوہ پنجابی زبان کی بھی بہت اچھی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے غالب کی
بعض غزلوں کو نہایت خوبصورت انداز میں پنجابی میں ڈھالا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری چند
برسوں میں عبدالعزیز فطرت نے بھی پنجابی میں کہنا شروع کر دیا تھا۔

اُردو ادب کی نشو و ارتقاء

اس صدی کے آغاز میں جب اس علاقے میں بھی تعلیم کا چرچا ہوا اور یہاں کے نوجوان جو اس سے پہلے صرف مکتبوں اور دینی مدرسوں میں تعلیم حاصل کیا کرتے تھے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پہنچے تو اُردو علم و ادب کی روشنی اس علاقے میں بھی پھیلنے لگی۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ اس سے پہلے لوگ اُردو ادب سے بالکل نا آشنا تھے۔ مکتبوں اور دینی مدرسوں میں بھی ذریعہ تعلیم فارسی اور اُردو زبانیں ہی تھیں۔ اس لئے لوگ ان زبانوں سے بخوبی آشنا اور کسی حد تک اُن کے ادب سے بھی لمس رکھتے تھے۔ لیکن چونکہ مکتبوں میں ادبی تعلیم سے زیادہ دینی تعلیم کی طرف توجہ دی جاتی تھی۔ اس لئے طلباء میں ادب کی وہ لگن پیدا نہ ہوتی جو کسی شخص کے خود ادب یا شاعر بننے کے لئے ضروری ہے اور جس کی پرورش ادب کے وسیع تر مطالعے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی سے پہلے علاقہ پوٹھوہار میں کوئی شاعر یا ادیب ایسا نہیں اُبھرا۔ جس نے اپنی نگارشات سے ادب میں کوئی مقام پیدا کیا ہو اور اس طرح اُردو ادب کی تاریخ میں جگہ حاصل کر سکا ہو۔ کہیں کہیں کسی قابل ذکر

شاعر کا پتہ تو چلتا ہے لیکن محض ذکر سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا مثلاً ایک صاحب رجب علی جوہر گزرے ہیں۔ یہ جوہر لوٹواری زبان کے معروف شاعر جوہر نہیں کہا جاتا سمجھے کہ یہ صاحب اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے خوشگو شاعر تھے۔ اور ان کے اشعار عوام و خواص میں بے حد مقبول بھی تھے لیکن بد قسمتی سے اب ان کا کلام ناپید ہے۔ جب علی جوہر انیسویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے اور بیسویں صدی کے اوائل تک زندہ رہے۔ انہیں چھوڑ کر اس طویل عرصے میں جیسے اردو شاعری میں مکمل نیا رنگ آ رہا ہے اگر کچھ لوگ شعر کہنے والے ہوئے بھی ہوں تو ان کے حالات پر کیسے تاریکی پر دہ پڑا ہوا ہے۔ بیسویں صدی کی آمد کے ساتھ ہی اس علاقے میں اردو زبان کے شعرا کا نام سننے میں آئے لگتا ہے۔ ان میں میر تقی میر، غلامی طاہر کا نام ہے۔ مروجہ کمال پیدا کس ۱۹۱۰ء بیان کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کچھ عرصہ آرڈیننس ڈپو میں کلرک کی بھی کی لیکن طبیعت فطرتاً آزاد تھی، اس لئے کلرک کی رائے نہ آئی چنانچہ کلرک کی جھوٹ کر سویڈن پیرا کے طریق علاج میں پریکٹس شروع کی۔ تاہم اس کام کی طرف بھی صرف اتنی ہی توجہ دیتے تھے جتنی کسب معاش کے لئے ضروری ہوتی۔ اس کے علاوہ جتنا بھی وقت میسر آتا شعر و ادب کی تلاش کرتے تھے۔ بڑے ہنگامہ پرور اور ہنگامہ پسند آدمی تھے۔ پناہ گزینوں اور ادبی انجمنوں کی تشکیل کرتے رہے۔ راولپنڈی میں اردو مشاعروں اور ادبی محفلوں کا صحیح معنوں میں آغاز آپ ہی نے کیا تھا۔ کلام نہایت صاف اور منجھا ہوا تھا۔ اردو محاورے اور روزمرہ پر عبور تھا۔ ان شعرا سادہ ہوتے تھے لیکن پیر تاثیر۔

بے نصف شب ہے اور فضا تاثیر سے معمور ہے

میں دعا گو ہوں دوام عیش و شمع کے لئے۔

۷ آنکھ مہتاب کے جھلکوں پر لگا رہتی ہے

منزلوں ان کے تصور میں چلا جاتا ہوں۔

مولانا خدابخش اظہر ام تسری، منشی عطا محمد کے ہم عصر اور شعر و ادب میں اُن کے زبردست حریف تھے۔ اظہر کے والد ام تسرے راولپنڈی آگئے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کا بیشتر حصہ راولپنڈی ہی میں بسر کیا۔ بعد میں وہ لاہور چلے گئے اور اخبار نویسوں کی برادری میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے کئی اخبارات میں کام کیا لیکن نہ زیادہ تر وقت مولانا ظفر علی خان کی ارادت اور ”زمیندار“ کے حلقہ ادارت میں گزرا۔ وفات کے وقت بھی وہ ”زمیندار“ ہی میں کام کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے ساتھ گہری عقیدتمندی نے اُن کے کردار میں مولانا مرحوم کی کئی صفات پیدا کر دی تھیں۔ اُن کی شاعری کا انداز بھی مولانا کی شاعری کی طرح سیاسی اور ہنگامی تھا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے سینکڑوں نظموں لکھیں۔ جو ”زمیندار“ اور دوسرے اخبارات کے صفحہ اول پر شائع ہو کر پڑھنے والوں کے جذبات میں ہلچل پیدا کرتی رہیں۔ لیکن اُن نظموں کے موضوعات میں چونکہ مستقل اقدار کا پر تو نہ تھا۔ لہذا انہیں ادب میں مستقل مقام حاصل نہ ہو سکا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں راولپنڈی میں ایک زبردست ادبی شخصیت نمودار ہوئی۔ یہ شخصیت قاضی سراج الدین مرحوم کی تھی۔ قاضی صاحب ایک کامیاب وکیل تھے اور حکومت اور عوام دونوں میں مقبول تھے۔ ادب سے زبردست لگاؤ رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ فارسی زبان میں شعر بھی کہتے تھے۔ تاہم شریکار کے طور پر اُن کی حیثیت مسلم ہے۔ اُن کی ایک مشہور و معروف تصنیف ”داستانِ پاستان“ ایک نہایت بلند پایہ ادبی شاہکار ہے۔ کانگریس اور کانگریسیوں کے مخالف تھے۔ تحریکِ خلافت کے دنوں میں انہوں نے ایک مختصر سا رسالہ ”تحریکِ خلافت اور ترکی“ کے عنوان سے لکھا۔ چونکہ اس رسالے میں جذبات پسندی سے ہٹ کر معقولیت پسندی کی تبلیغ کی گئی تھی۔ لہذا قدرتی طور پر اس کی اشاعت سے ملک میں ہلچل مچ گئی۔

قاضی صاحب کے زورِ قلم کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد جیسے شخص نے بھی اس رسالے کے متعلق اپنے اخبار ”الہلال“ میں تفصیلی طور پر تذکرہ اور اس پر تبصرہ کیا۔

قاضی نیراج الدین بڑے عالی دماغ اور روشن خیال انسان تھے وہ تعلیم کی اشاعت میں نہایت سرگرمی سے کام کرتے تھے۔ راولپنڈی میں انجمن اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے۔ اس انجمن نے اس زمانے میں تعلیمی میدان میں مسلمانوں کی عیش بہا خدمات سرانجام دیں۔ چنانچہ قاضی صاحب کو راولپنڈی کا سرسید بھی کہا جاتا ہے۔ تعلیمی میدان میں کام کرنے کے علاوہ وہ میدانِ صحافت میں بھی پیشرو تھے۔ انہوں نے راولپنڈی سے سب سے پہلا اخبار ”ہفت روزہ“ چودھویں صدیء جاری کیا۔ یہ اخبار اسی نام کے پریس سے شائع ہوتا تھا۔ جو راولپنڈی کا پہلا پرنٹنگ پریس تھا۔ ادب سے اپنے اس شغف کی بنا پر قاضی صاحب نے چند دوستوں کے تعاون سے ”بزمِ سخن“ کی بنیاد رکھی۔ اس بزم کی داغ بیل ۱۹۲۰ء میں ڈالی گئی اور یہ تقریباً آٹھ نو سال تک کام کرتی رہی۔ کچھ عرصہ حافظ عبدالرشید جوا بھی تک نہ صرف بقیدِ حیات ہیں، بلکہ نہایت چاق و چوبند اور تندرست و توانا بھی ہیں، اس بزم کے معتمد رہے ”بزمِ سخن“ کے زیرِ اہتمام کبھی کبھی شعروِ سخن کی مجلسیں سجا کرتی تھیں جن میں شہر کے چیدہ چیدہ ادبی ذوق رکھنے والے لوگ شازل ہوا کرتے تھے۔

اس زمانے میں راولپنڈی کے علاوہ پوٹھوہار کے دوسرے مقامات پر بھی ادبی شخصیتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ ان میں سے نمایاں ترین شخصیت ڈاکٹر غلام سیالانی برقی کی ہے ڈاکٹر صاحب کیمپور کے ایک گاؤں بساآل کے رہنے والے ہیں۔ لیکن بایں کے سلسلے میں کیمیل پور پہنچے تو وہیں کے ہو رہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خود کوزہ و خود کوزہ گر، و خود کل کوزہ کہا جاتا ہے کیمیل پور جیسے علمی طور پر منسل اور بھر

علاقے میں بیٹھ کر انہوں نے خود اپنی فطری بصیرت کے بل بوتے پر گراں بہا علمی فتوحات حاصل کیں۔ اور رسمی تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ ان کی تحریروں میں جوش اور استدلال دونوں خاصیتیں بیک وقت موجود ہیں۔ یوں تو ان کی کئی تصنیفات ہیں۔ لیکن دو قرآن کی وجہ سے انہیں علمی حلقوں میں خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب تمام عمر فارسی ادب کی تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی میں بھی اچھا شعر کہتے ہیں۔ اور اردو میں بھی۔ لیکن ان کی شہرت کا دار و مدار ان کی نثری تصنیفات پر ہے۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ جب دوستوں میں بیٹھتے ہیں تو بڑے زوردار قبچھے لگاتے ہیں۔ کیمبل پور کی مجلسی زندگی کی ادھی رونق ان کی شگفتہ مزاحی کی مرہون منت ہے۔

اسی زمانے میں چکوال میں جناب ذکاء اللہ بسمل شعر و ادب کے اُفق پر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ بسمل صاحب ڈاکٹر برحق کے قریباً ہم سن ہیں۔ وکالت کرتے ہیں لیکن وکالت سے زیادہ انہیں شعر و ادب سے شغف رہا ہے۔ کسی زمانے میں ”ہیالوں“ اور ”ادبی دنیا“ جیسے جرائد میں ان کی نظمیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان کے کلام میں فکر کا عنصر غالب تھا۔ اب ایک عرصے سے شعرو سخن سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ لیکن ادب کی چاٹ ایسی ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ چنانچہ بسمل نے قانون کی دنیا میں رہ کر بھی ادب کا دامن نہیں چھوڑا۔ کچھ عرصہ ہوا۔ انہوں نے قانون وراثت پر ایک جامع اور مبسوط کتاب لکھی ہے۔ جو ”ذکائیہ“ کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

منشی عطا محمد طاہر کے زمانے سے پہلے کے ایک شاعر منشی غلام نبی کمال تھے۔ جو پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ جامع مسجد راولپنڈی

کی تعمیر کے سلسلے میں انہوں نے بہت کام کیا۔ کمال صاحب نے ۱۹۵۵ء میں وفات پائی۔ ان کا کلام ان کے فرزند ارجمند جناب عبد العزیز فطرت کے پاس موجود ہے۔ تحریک خلافت کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمہ جہتی بیداری کا زمانہ تھا۔ اس تحریک نے ان کے دلوں میں حریت کی وہ چنگاری جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد حادثات کی گہری راکھ میں دب کر رہ گئی تھی، از سر نو روشن کر دی۔ انیسویں صدی کا ربح آخر ہندی مسلمانوں کی مایوسی اور افسردگی کا دور تھا۔ تحریک خلافت نے اس مایوسی اور افسردگی کو دور کر کے ان کے دلوں میں امنگوں اور دلولوں کو بیدار کر دیا۔ مسلمان ہر چیز کو نئی نقطہ نظر سے دیکھنے لگے۔ ملیت کے جذبے نے انہیں از سر نو جدوجہد کے میدان میں لا آتارا۔ اسی زمانے میں علامہ اقبالؒ کی ولولہ انگیز منظومات منصب شہود پر جلوہ گر ہوئیں۔ ان منظومات نے ہندی مسلمانوں کے ذہنی دھارے کا رخ موڑ دیا۔ چنانچہ وہ لوگ جو اس عہد میں جوان ہوئے، حریت پسند اور آکادی خواہی کے جذبات سے سرشار تھے۔ اردو ادب میں اس دور کو ہم اقبالؒ کا دور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس دور میں جتنے بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں، ان سب کی نگارشات قومی رنگ میں رنگی ہوئی تھیں۔

اردو زبان اور اردو ادب سے مسلمانوں کو ہمیشہ نہایت گہرا شغف رہا ہے۔ لیکن بغیر کی ملی تحریکات نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ ملک میں جا بجا ادبی حلقے اور مجالس قائم ہونے لگیں۔ جن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت کو ایک مقدس قومی فریضہ سمجھا جائے۔ یہی زمانہ تھا جب اردو بولو، اردو پڑھو اور اردو لکھو کے نعرے ہر طرف بلند ہوتے تھے۔ تحریک خلافت کو زوال آیا تو مسلم لیگ کے عروج کا زمانہ شروع ہوا۔ لیکن اردو زبان کی تبلیغ و اشاعت روز بروز ترقی پذیر ہی رہی۔ تحریک خلافت کے راہنما کانگریس سے اتحاد اور اشتراک عمل کے حامی

تھے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جداگانہ قومیت کا احساس دلایا۔ کانگریسی رہنماؤں کی کوتاہ اندیشیوں نے اس جداگانہ قومیت کے احساس کو اور تقویت بخشی۔ جی ٹی کہ ۱۹۴۰ء میں تحریک پاکستان مسلمانوں کی اُمنگوں اور آرزوؤں کا نصب العین بن گئی۔ اردو زبان کے تحفظ اور تباہی کی کوششیں بھی سیاسی تباہ اور استحکام کی کوششوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔

اس دور میں راولپنڈی میں ادبی تحریکات سحر کی تند تیز لہروں کی طرح ابھرنے لگیں۔ بزم سخن کے بعد بزم ادب کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہوئی۔ یہ پہلی ادبی انجمن تھی جس کا تعلق ایک ملک گیر ادبی تحریک سے تھا۔ بزم ادب اور انجمن ترقی اردو کے روح رواں عبدالعزیز فطرت تھے۔ اس باہمت شخص نے راولپنڈی میں علم و ادب کی آبیاری جس محنت اور غلوں سے کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

فطرت کا راولپنڈی کی ادبی شخصیتوں میں نہایت منفرد اور ممتاز مقام ہے۔ وہ علم و ادب کا ایک بے لوث خادم اور شعرو سخن کا سچا پرستار ہے۔ اپنی لازمت کی غیر معمولی مصروفیتوں کے باوجود اس نے شعرو ادب کی لگن کو کبھی کم نہیں ہونے دیا۔ اصناف سخن میں سے نظم اور غزل دونوں پر اسے پوری دسترس حاصل ہے۔ اس کا کلام ملک کے چیدہ چیدہ برائیدین بالالترام دیکھنے میں آتا ہے۔

فطرت کے ساتھ ساتھ عدم بھی اسی شہر سے اُفق ادب پر جلوہ گر ہوا۔ عدم نے آغاز نیچرل شاعری سے کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا میلان طبع اُسے غزل کی طرف لے گیا۔ اس میدان میں اُسے کچھ عرصے کے بعد بید مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ آج کل اس کا نام فطرت کو سچ کرنے کی بڑی آرزو تھی ۱۹۶۷ء میں اللہ نے یہ آرزو پوری کی لیکن واپسی کے بعد جلد ہی ایسے بیمار ہوئے کہ ۵ اکتوبر کے روز اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شمار ملک کے بہترین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ اس طرح کی غزل کے ساتھ ساتھ ان کے قطعات میں بھی بڑی زندگی اور جان ہے۔

ہر چند کہ راولپنڈی عدم کا آبائی وطن نہیں تاہم اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی شہر میں بسر کیا ہے۔ اس لئے اس کا شمار راولپنڈی کے شعراء میں کیا جاتا ہے۔

فطرت اور عدم کے دور کا ایک اور شاعر آغا صدیقی حسن ضیا مابری تھا۔ ضیا نے کالج میں بی، اے تک تعلیم پائی لیکن طبعاً صوفی منش اور درویش مشرب انسان تھا۔ اُسے دنیوی نمود و نمائش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اس نے زندگی بھر خلوت نشیں رہ کر اپنا وقت یاد الہی اور فکرِ سخن میں گزارا۔ اس کے کلام میں تصوف کا گہرا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثنوی ”مقام محمود“ بڑے زوروں کی چیز تھی۔ جو جناب غلام نبی کاکل کے اہتمام سے شائع ہوئی۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ پہلے راولپنڈی میں ایک بزرگ شاعر حاجی سرحدی مرحوم کا بڑا چچا تھا۔ حاجی صاحب ان دنوں میں اپنی عمر نوے برس کی بیان کرتے تھے۔ لیکن اتنی بڑی عمر ہونے کے باوجود نہایت زندہ دل اور مخلص آرا شخص تھے۔ جس محل میں موجود ہوتے اسے چٹکوں اور لطیفوں سے کشتِ زعفران بنا دیا کرتے تھے۔ تاریخ گوئی میں انہیں بالخصوص کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ادھر کسی نہ کسی واقعہ کی تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ ادھر حاجی صاحب نے نہایت موزوں اور برجستہ مصرع تاریخ کہہ دیا۔ بعض نوجوان شعراء کو ان کی اس فی البدیہہ تاریخ گوئی سے یہ بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ حاجی صاحب لوگوں کی اعداد و ابعاد سے عمومی ناواقفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر مصرع کو تاریخی مصرع کہہ کر یار لوگوں کو مرعوب کرتے پھر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے مصرعے ممکن ہے تاریخی نہ ہوتے ہوں۔ چنانچہ کچھ نوجوان شعراء نے حاجی صاحب

کے ان مصرعوں کو لکھ کر بعد میں جاچکے بھی کی۔ لیکن یہ مصرعے فی الواقعہ تاریخی مصرعے ثابت ہوئے۔

اس زمانے میں ہمیں بعض اچھے کہنے والے غیر مسلم شعراء بھی نظر آتے ہیں۔ جن میں سے کچھ تو ہمیں کے رہنے والے تھے، کچھ باہر سے آکر یہاں مقیم ہو گئے تھے، باہر سے آنے والے شعراء میں سے تلوک چن محروم اور جگن ناتھ آزاد سب سے نمایاں ہیں۔ محروم ضلع میانوالی کے رہنے والے تھے۔ وضع قطع، لباس، گفتار اور رفتار سے فوراً پہچانے جاتے تھے کہ محفل کے رہنے والے ہیں۔ ہمیشہ اونچے کلاہ پر لنگی باندھتے تھے۔ یہاں تک کہ تقسیم ہند سے ان کا وطن بدل گیا لیکن وضع قطع نہ بدلی۔

محروم کے شاعرانہ کمالات سے تمام دنیا واقف ہے۔ اس لئے یہاں ان کی شاعری کے تفصیلی تذکرے یا اس شاعری پر کسی قسم کے تبصرے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ ان کی زبان نہایت صاف اور سنجی ہوئی ہے اور یہ وہی زبان ہے جس میں اردو زبان کے مستند اور مشاہیر شعراء شعر کہتے آئے ہیں۔ ان کے انداز سخن میں قدیم فارسی اساتذہ کا اثر نمایاں ہے۔

محروم محکمہ تعلیم سے متعلق تھے اور انہوں نے اپنی ملازمت کا بہت بڑا حصہ کلور کوٹ اور دریا خان جیسے دور افتادہ دیہاتی سکولوں میں گزارا۔ ریٹائر ہوئے سے کچھ عرصہ پیشتر وہ کنٹونمنٹ بورڈ سکول راولپنڈی کے ہیڈ ماسٹر ہو کر یہاں آئے۔ اس ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد گارڈن کالج میں اردو کی تدریس پر مامور ہو گئے۔ اور تقسیم ہند تک اسی کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان کے فرزند ارجمند جگن ناتھ آزاد نے گارڈن کالج ہی میں تعلیم حاصل کی۔ شاعر باپ کا یہ شاعر بیٹا نوجوانی کے زمانے ہی سے شعروادب کی طرف مائل تھا۔ وہ کچھ عرصہ گارڈن میں رہنے کے اردو سیکشن کا ایڈیٹر اور گارڈن کالج کی

بزمِ ادب کا معتقد بھی رہا۔ کالج کے زمانے سے ہی اس کی شاعری کے چرچے ہونے لگے تھے۔ شاعر و ادب کی دھن نے اسے درس و تدریس کے میدان کی بجائے صحافت کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ چنانچہ وہ راولپنڈی سے لاہور چلا گیا اور تقسیمِ ہند تک لاہور کے مختلف اخبارات میں کام کرتا رہا۔

محرم اور آزاد دونوں اردو زبان کے دانشور و شیدا اور اردو ادب کے سچے خدمت گزار ہیں۔ ہندوستان پہنچ کر بھی انہوں نے اردو کی خدمت اور اشاعت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہوا ہے۔ تقسیم کے بعد آزاد نے چند اچھی نظمیں لکھی ہیں جن میں درد اور کسک کی فردا نی ہے۔ اس کی ایک نظم ”وطن میں اجنبی“ خاص طور پر مقبول ہوئی۔

۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ راولپنڈی کی ادبی زندگی میں انجمن ترقی اردو کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں اس انجمن کے زیرِ اہتمام بعض نہایت عمدہ مشاعرے اور ادبی اجلاسیں منعقد ہوئے۔ مسلمان اور غیر مسلم شعراء اور ادباء اس انجمن میں دوش بدوش نہایت خلوص اور دلسوزی سے کام کرتے رہے۔ غیر مسلم شعراء میں سید محرم اور آزاد کا ذکر تو آ ہی چکا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے بہیم دت المتخلص بہ ہمایوں نالوی اور برج لال رعنا جگت اس انجمن کے سرگرم ارکان میں سے تھے، یہ دونوں حضرات آج کل ہندوستان میں بھی اردو زبان و ادب کی خدمت میں اسی جوش و انداز سے مصروف ہیں جس جوش و انداز سے راولپنڈی میں مصروف رہا کرتے تھے۔

اسی دور میں راولپنڈی میں چند نہایت سلیجے ہوئے نثر نگار بھی ابھرے ہیں۔ ان میں پروفیسر رام ناتھ یاس، پروفیسر پرمان سنگھ، پروفیسر محمد اعظم اور عزیز ملک کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یاس، پرمان سنگھ اور

اعظم، تینوں مختلف کالجوں میں استاد تھے۔ اعظم نثر نگار ہونے کے علاوہ اچھے شاعر بھی تھے، جوانی کے زمانے میں انہوں نے نہایت کامیاب نظمیں اور عمدہ غزلیں کہی تھیں لیکن بعد ازاں شعر گوئی کو خیر باد کہہ کر صرف نثر نگاری کا شغل جاری رکھا۔ ان کے انداز نگارش میں سنجیدگی اور طنز و مزاح کا بڑا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ وہ بات بات میں ہنکتے پیداکرتے تھے اور چٹکوں میں مسائل زندگی پر نہایت بھرپور تبصروں کو جایا کرتے تھے۔

اعظم ایک نہایت مخلص اور با اصول انسان تھے۔ وہ ایک بہترین استاد، بڑے اچھے دوست اور نہایت با اثر شخصیت کے مالک تھے۔ گارڈن کالج میں پڑھے ہوئے لوگ آج تک ان کا نام نہایت ادب اور احترام سے لیتے ہیں۔ کالج کے انگریز پرنسپل ہر معاملے میں ان کی رائے لیتے اور اس رائے کی قدر کرتے تھے۔ وہ اسی کالج کے پڑانے طالب علم تھے اور تکمیل تعلیم کے بعد یہیں استاد ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں کچھ عرصے کے لئے گورنمنٹ سروس میں چلے گئے۔ لیکن گارڈن کالج کی محبت انہیں پھر کھینچ لائی۔ کالج کے جو بی ہال کی تعمیر کے لئے ابتدائی کوششوں میں انہوں نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ لیکن افسوس کہ موت نے انہیں ہم سے بہت جلد جدا کر دیا۔ اور ۱۹۵۴ء کے موسم گرما میں راولپنڈی کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ کالج کے سٹاف روم میں مرحوم کی تصویر دیکھ کر اب بھی ان کے احباب کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں۔

عزیز ملک اس وقت ملک کے بہترین انشاز پر وازوں میں سے سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایک لطیف ٹیکہ اپن پایا جاتا ہے۔ وہ عام بات کو خاص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ محاورے اور روزمرے کا استعمال نہایت سلیسے ہوئے اہل باز کرتے ہیں۔ اپنے مذہبی معتقدات کی طرح اپنے ادبی نظریات

میں بھی نہایت راسخ العقیدہ انسان ہیں۔ اس لئے جب کبھی نظریے اور عقیدے کی بحث ہوتی ہے۔ اُن کا قلم دو دھاری تلوار بن جاتا ہے۔ اُن کے مضامین ملک بھر میں شہور آدی جہاں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے "خونِ حسین" خاص طور پر مشہور ہے۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عالمگیر کا خاتمہ ہونے کے ساتھ ہی نظریاتی قسم کی ادبی گروہ بندی کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز تو برصغیر میں ۱۹۳۵ء ہی سے ہو چکا تھا۔ لیکن پہلے دس سالوں میں اس تحریک میں صرف انتہا پسند قسم کے لوگ شامل ہوئے۔ جنگ کے زمانے میں انگریزوں کے سخت گیرانہ اقدامات کی وجہ سے اہل فکر و نظر پر زبان بندی کی سی کیفیت بھی طاری رہی۔ یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں اس تحریک کے خط و خال بھی نمایاں نہ ہوئے۔ چنانچہ ہر اس ادیب یا شاعر کو جو ہیئت اور اسلوب میں کسی جدت کو اپنانے کی کوشش کرتا تھا، ترقی پسند سمجھا جاتا۔ جب ۱۹۴۱ء میں روس کو طوعاً و کرہاً امریکہ اور برطانیہ کا حلیف بننا پڑا تو ہندوستان میں بھی انگریزوں کو کمیونسٹوں کے ساتھ اپنے سلوک میں نرمی اختیار کرنی پڑی۔ اس دور میں کمیونسٹ تحریک کے علمبردار اور اُن کے ہم سفر ترقی پسند ادیب میدانِ عمل میں نمودار ہوئے۔ اور اس طرح ترقی پسند تحریک کو اس ملک میں تقویت حاصل ہوئی۔

ترقی پسند تحریک چونکہ ہر قسم کے سامراج کی مخالف تھی۔ اس لئے اس برصغیر کے باشندوں اور ادیب جو تقریباً تمام کے تمام عملی طور پر یا ذہنی طور پر اس جدوجہد آزادی میں نہایت سرگرمی سے شریک تھے۔ اس تحریک سے متاثر ہوئے چنانچہ اس زمانے میں نہایت معتدل مزاج ادیب بھی ترقی پسندی کی طرف مائل نظر آنے لگے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں لاہور کے مقام پر ترقی پسند ادیبوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس کی ایک نشست کی صدارت مولانا عبد الحمید سالک اور ایک اور نشست

کی صدارت حفیظ جالندھری نے کی۔ اس کانفرنس کے بعد پاکستان میں بھی ترقی پسند تحریک بھولنے پھلنے لگی۔

۱۹۴۷ء کے پُر آشوب زمانے میں راولپنڈی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم ہوئی۔ نوجوان ادباء اور شعراء فوراً اس انجمن میں شامل ہو گئے۔ اور انہوں نے بڑے جوش و خروش اور سرگرمی سے کام کرنا شروع کیا۔ اسی سال کے اواخر میں راولپنڈی میں حلقہ ارباب ذوق کا قیام بھی عمل میں آیا۔ اور اس کے زیر اہتمام ہفت روزہ تنقیدی اجلاس ہونے لگے۔ وہ شعراء اور ادیب جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور اور طریق کار سے متفق نہ تھے۔ حلقہ ارباب ذوق میں شامل ہو گئے۔ قریباً سال تک انجمن ترقی پسند مصنفین کا خوب زور شور رہا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں جب حکومت نے اسے ایک سیاسی جماعت قرار دیا تو یہ انجمن ختم ہو گئی۔ حلقہ ارباب ذوق کی مقامی شاخ البتہ ۱۹۵۹ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی۔

قیام پاکستان کے بعد راولپنڈی کی ادبی زندگی کے ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز ہوا۔ کچھ شاعر اور ادیب ہجرت کر کے راولپنڈی پہنچے اور کچھ ملازمت کے سلسلے میں یہاں آ گئے۔ اس طرح راولپنڈی کو ایک بہت بڑے ادبی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ادبی سرگرمیاں بڑھنے لگیں۔ تنقیدی اور غیر تنقیدی محفلیں، مشاعرے اور میاں ملنے ہونے لگے۔ ۱۹۴۸ء میں راولپنڈی میں گورنمنٹ کالج قائم ہوا۔ اور ۱۹۵۰ء میں مقامی ریڈیو سٹیشن کھل گیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۹ء میں یہاں سے دور دراز مومن "تعمیر" اور "بادِ شمال" کا اجراء ہوا۔ چکا تھا۔ "بادِ شمال" کے چیف ایڈیٹر سید ضمیر بھڑی تھے۔ لیکن اس کے چھوٹے صرف چند ماہ تک اہل ذوق کی تسکین قلب و نظر کا سامان مہیا کر سکے۔ "تعمیر" نے البتہ اپنے قدم مضبوطی سے جمائے اور آج کل اس کا شمار ملک کے اچھے اور سلیجے ہوئے اخبارات میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہاں سے روزنامہ "کوہستان" کا اجراء ہوا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کی بلندگیوں پر جا پہنچا۔ آج کل یہ اخبار راولپنڈی، لاہور اور کتان سے بیک وقت

سے اب حلقہ دوبارہ معروف عمل ہے بلکہ اسلام آباد میں بھی قائم ہو گیا ہے۔

شائع ہوتا ہے۔ تین چار سال ہونے لاپور کا مشہور روزنامہ "نوائے وقت" راولپنڈی سے بھی شائع ہونا شروع ہوا۔ گزشتہ پانچ سال کے اندر یہاں کئی نئے کالج بھی کھل گئے ہیں۔ جن میں سے گورنمنٹ کالج برائے خواتین، وقار النساء ہائر سیکنڈری سکول اور گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام ادارے راولپنڈی کی علمی زندگی میں گراں قدر اضافے کا باعث ہوئے ہیں۔ ان سے ایک تو عام فضا میں علم و ادب کا اثر نمایاں ہو گیا ہے، دوسرے بہت سے مشہور و معروف ادیب اور شاعر بھی ان سے منسلک ہو کر راولپنڈی آ پہنچے ہیں۔

سب سے پہلے ہیں ان شعرا اور ادباء کا ذکر کرنا چاہیے جو خطہ پوٹھوہار کے رہنے والے ہیں اور جو قیام پاکستان کے بعد شعر و ادب کے آفاق پر نمایاں ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند نام خاص طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ نام ضمیر جعفری، باقی صدیقی، الیہ محسن، کرم حیدری اور صادق نسیم کے ہیں۔ ان میں سے کرم حیدری تو خود ان سطور کا لکھنے والا ہے۔ اس لئے باقی حضرات کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ضمیر جعفری جہلم اور راولپنڈی کے درمیانی علاقے کے رہنے والے ہیں۔ ان کے گاؤں کا نام چک عبدالحق ہے۔ اگرچہ ضلع جہلم تعلیمی اعتبار سے ملک کے پسماندہ ترین اضلاع میں سے ہے۔ جہاں دور دور تک گزرتجواٹ نظر نہیں آتا۔ لیکن سادات کے اس پھوٹے سے گاؤں میں دس بڑا گزرتجواٹ ہیں۔ یہ سب لوگ ضمیر جعفری کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضمیر کے بھائی بند عام طور پر سول محکموں میں اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ لیکن ضمیر نے اہل قلم ہونے کے باوجود تلوار سنبھالنے کو بہتر سمجھا۔ پھر بھی اس مرد مجاہد نے قلم کو فراموش نہ کیا۔ کل جب کپتان ضمیر جعفری کا نام بھی کسی کو یاد نہ ہے گا، شاعر ضمیر جعفری ہزاروں دلوں کو اپنے شعروں اور گیتوں سے گرما رہا ہوگا۔

غیر جزئی نہایت اچھی غزل اور نظم کہتے والا ہے۔ زبان و بیان میں سنجیدگی اور سادگی کا خیال رکھنے والا اور شعر کی نوک پلک سنوارنے میں کد و کاوشیں سے کام لینے کا عادی ہے۔ اسی لئے اس کے اشعار تنقید کی کسوٹی پر پورے آتے ہیں۔ اس کے شعر میں جذبہ اور کیفیت کی فراوانی بھی ہے اور فن کی سادہ پرکاری بھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے لئے مزاج کا میدان منتخب کیا ہے۔ اور اس کی مزاجیہ شاعری ہی اس کی شہرت کا باعث بنی ہے۔ تاہم اس کی سنجیدہ شاعری بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اور مطالعے کے لائق۔ نظم کے علاوہ وہ نثر کے میدان کا بھی شہسوار ہے۔ اس کی نثر میں طنز و مزاح کی حسین آمیزش ہے جو کٹھن مطالعہ کو دو بالا کرتی ہے۔

باقی مدد لیتی راولپنڈی کے ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ آغاز شاعری میں اس نے فطرت اور عدم دونوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس لئے دونوں کا بہت احترام کرتا ہے۔ یوں تو وہ نظم بھی کہتا ہے، لیکن غزل اس کی خاص چیز ہے۔ غزل میں بھی چوٹی بحر اسے خاص طور پر اس آتی ہے۔ اس کی غزل میں نہ زندانِ پن ہے، نہ گہرا فلسفہ، وہ عام زندگی کے مسائل کو غزل کے روپ میں ڈھال کر اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ سننے والا جھوم اٹھتا ہے۔ اس کی غزل کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن ابھی اس دریا میں بہت سی لہریں ہیں، جنہیں الفاظ کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

ایوب مہمن بھی راولپنڈی کے دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے والد دیہات کو چھوڑ کر راولپنڈی میں آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے اب وہ خاص راولپنڈی کا شہری ہے۔ اس کی طبیعت فطرتاً شعرو شاعری سے مناسبت رکھتی تھی۔ اور اس نے کچھ عرصہ بڑی جاندار شاعری بھی کی لیکن اب ایک عرصے سے شاعری کو چھوڑ کر نثر نگاری کو اپنا لیا ہے۔ اس نے فن شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس

لئے ایک بالغ نظر ناقد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حلقہ شعراء میں اسے نہایت قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

محسن بہ حیثیت انسان ایک بہت بلند کردار کا مالک ہے۔ وہ غلو و محبت کا پیکر ہے۔ پشاور، لاہور اور کئی دوسرے شہروں کے مشہور شعراء جب کبھی راولپنڈی آتے ہیں، محسن سے ضرور ملتے ہیں۔ اس دور میں جب اشار و محبت کے محاسن مفقود ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس شہر میں محسن کا دم بہت غنیمت ہے۔ صادق نسیم ٹیکسلا کے ایک قریبی گاؤں ختم کار رہنے والا ہے۔ اس نے راولپنڈی میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن بدتر متی سے تکمیل سے پہلے ہی اسے ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ اس نے کچھ عرصہ لٹری اکاڈمیس کے دفتر میں ملازمت کی لیکن لکڑی اس کے بس کا روگ نہ تھی لہذا افسرین کو فوج میں چلا گیا۔ فارسی شاعری کا متوالا ہے اور نظمیں اور قالب کا دیوانہ، شاعری میں اس نے صنفِ غزل کو اپنایا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس کی غزل میں بڑی کیفیت ہوتی ہے۔ اردو کے علاوہ پورٹوگیزی زبان میں بھی شعر کہتا ہے۔

راولپنڈی شہر کے رہنے والے شعراء میں انجم رضوانی، افضل پرویز، جمیل ملک اور احمد ظفر کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ انجم رضوانی کا ذکر فطرت اور عدم کے ساتھ آنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ان تینوں کی شاعری کا آواز تقریباً ایک ہی زمانے میں ہوا تھا۔ جہاں تک فن اور اس کی رعایتوں کا تعلق ہے۔ انجم رضوانی، فطرت اور عدم سے آگے ہیں۔ ان کے اشعار میں فنی نزاکتیں برجستہ آتم پائی جاتی ہیں۔ وہ اپنے شعر کی نوک پلک سنوارنے میں بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد قریب خاموش ہو چکے ہیں۔ اور آج کل تو مشاعروں میں بھی شرکت نہیں کرتے۔

افضل پرویز، انجم رضوانی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ یہ شخص تمام ازل سے ایک نہایت متنوع طبیعت لے کر آیا ہے۔ چنانچہ شاعری، معنوی اور موسیقی تینوں میں

مہارت رکھتا ہے۔ اُسے شعر و ادب سے بغایت شغف ہے۔ اُردو کے علاوہ پوٹھوہاری زبان میں بھی اچھے شعر کہتا ہے۔ پوٹھوہاری لوگ گیتوں سے اچھی طرح واقف ہے اور ہر لوگ گیت کی مخصوص دُھن میں بھی دستگاہ رکھتا ہے۔ شعر میں الفاظ کی موسیقیت سے خوب کام لیتا ہے۔

جیل ملک اور احمد ظفر راولپنڈی کے نئے شاعروں کے سالار ہیں۔ ہر چند کہ دونوں نے نغمین بھی لکھی ہیں لیکن بنیادی طور پر دونوں غزل گو ہیں۔ جیل ملک کی شاعری کے ابتدائی دور میں کچھ محرومیت اور کچھ قنوطیت کی جھلک نظر آتی تھی۔ لیکن اب یہ چیز کم ہو چکی ہے اور ہمیں اُس کے اشعار میں رجائیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ احمد ظفر اُردو زبان کے علاوہ پنجابی زبان کا شاعر بھی ہے۔ اُس کی پنجابی شاعری میں وسطی پنجاب کی زبان کا اُرس اور لوح ہے۔

پاکستان بننے کے بعد بہت سے شعراء اور ادباء کا زمت کے سلسلے میں منسلک ہو کر راولپنڈی پہنچے۔ اُن میں سر سہرست ابوالاثر حفیظ جالندھری کا نام ہے۔ جو ۱۹۴۷ء کے اواخر میں یہاں آئے اور تحریک آزاد کشمیر کے ساتھ وابستہ ہو کر یہیں کام کرنے لگے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ افواج پاکستان کے ایک محکمے کے سربراہ ہوئے۔ اور ایک عرصے تک خدمات سر انجام دیتے رہے۔ لیکن انہوں نے مستقل طور پر راولپنڈی میں قیام نہ کیا اور جلد ہی ولیج ایڈ کے محکمے سے منسلک ہو کر کراچی چلے گئے۔

حفیظ جالندھری کی طرح ملک کے ممتاز افسانہ نگار ممتاز مفتی بھی راولپنڈی پہنچے۔ اور انہوں نے کچھ عرصہ یہاں قیام کیا لیکن پھر وہ بھی کراچی چلے گئے۔ آغا بابہ بھی گذشتہ کے سلسلے میں راولپنڈی آئے اور آج تک یہیں مقیم ہیں۔

راولپنڈی میں ریڈیو پاکستان کا اسٹیشن قائم ہونے پر کئی خوش گو اور مشہور شعراء یہاں پہنچے۔ اُن میں سے یوسف ظفر، مختار صدیقی اور مسعود قریشی کے نام خصوصیت

سے قابل ذکر ہیں۔ یوسف قفر ملک کے جانے پہچانے شاعروں میں سے ہیں۔ انہوں نے
 اردو شاعری میں آزاد نظم کے بڑے کامیاب تجربے کئے۔ لیکن پابند نظم کا دامن بھی ہاتھ
 سے نہ جانے دیا۔ نظم کے علاوہ غزل کی آرائش اور شاہکی میں بھی انہوں نے بڑی کوشش
 اور لاسوردی سے کام لیا۔ ان کے تغزل میں جذباتیت اور سطحیت کی بجائے فکر اور گہرائی
 پائی جاتی ہے۔ مختار صدیقی طبعاً خلوت گزریں اور درویش منش ہیں۔ اس لئے عام شاعروں
 اور ادبی جلسوں میں شرکت سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن شعر و ادب میں ان کا ایک خاص
 مقام ہے۔ انہوں نے طویل آزاد نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی شہرت
 کا باعث سدھریاں ہیں۔ سدھرنی کی صنف خالصتاً پنجابی اور پوٹھوہاری شاعری کی
 چیز ہے۔ مختار نے اسے اردو شاعری میں مروج کیا ہے۔ مسعود قریشی کم گو اور
 کم سخن ہیں۔ لیکن جو کہتے ہیں وہ درحقیقت کے لحاظ سے وقیح اور قابل لحاظ ہوتا ہے۔
 بہت سے ادباء اور شعراء ہجرت کر کے راولپنڈی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں
 مشہور ناول نگار نسیم جہازی جو تقسیم ہند سے پہلے عام طور پر کوئٹہ اور لاہور
 میں بود و باش رکھتے تھے، تقسیم ہند کے بعد راولپنڈی آ گئے اور یہاں ان کی
 نگرانی میں روزنامہ ”تعمیر“ کا اجراء ہوا۔ انہیں اپنی سکونت کے لئے راولپنڈی سے
 زیادہ ایبٹ آباد پسند آیا۔ یہاں بیٹھ کر انہوں نے چند نئے ناول لکھے۔ لیکن آجکل وہ
 صرف موسم گرما کے چند مہینے ایبٹ آباد میں گزارتے ہیں۔ اور سال کا باقی حصہ راولپنڈی
 میں رہتے ہیں۔

اخبار ”کمرستان“ میں کام کرنے والے حافظ مظہر الدین ایک شعلہ بیان شاعر
 ہیں۔ ان کی تمام تر زندگی اسلام اور جہاد کے لئے وقف ہے۔ جہاد کشمیر کے سلسلے میں
 انہوں نے کئی نہایت پُر جوش نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے دو مجموعے ”شمیر و سناں“
 اور ”عرب و ضرب“ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبے اور جوش

کی فراوانی ہے۔

۱۹۲۶ء میں نواب اشک رامپوری مستعین طور پر ہجرت کر کے راولپنڈی چلے آئے تھے۔ وہ نہایت متقی اور درویش صفت انسان تھے۔ پیر صاحب گولڑہ شریف کے مخلص ترین مریدوں میں سے تھے۔ زندگی کے آخری ایام انہیں کے آستانے پر بسر کئے۔ جہاں آج سے دو سال پہلے ان کا انتقال ہوا۔ اشک غزل کے شاعر تھے۔ ان کی غزل میں سوز و گداز، عاشقانہ سرمستی اور جذب و سرور کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ اور فنی رعایتوں کے اعتبار سے کلام میں اساتذہ کا رنگ جھلکتا ہے۔

حسرتیں اور تباہی میری
ہائے ناکردہ گناہی میری
خیر سے آج ارادے کیا ہیں
خیر کیوں آپ نے چاہی میری
مدعی تم ہو تو انصاف کرو
کوہن دیتا ہے گلابی میری

خورشید النور جیلانی جب راولپنڈی پہنچے تو ملازمت کر رہے تھے۔ لیکن یہاں آکر انہوں نے ملازمت ترک کی اور دکالت شروع کر دی۔ وہ تعصوف پسند شاعر ہیں اس لئے ان کی غزل میں قدیم صوفی شعرا کی سہی سادگی اور سوز و گداز کی سی کیفیت ہے۔ وہ سالہا سال سے شغوی مولانا روم کا اسی بحر میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے اور اگر خورشید النور جیلانی جیسا معروف آدمی اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دے تو یقیناً ایک عظیم کا نام ہوگا۔

قیام پاکستان کے آغاز ہی میں صفیہ شمیم بلنج آبادی بھی راولپنڈی آئیں۔ ان کے

شہر محکمہ دفاع کے ایک شعبے میں ملازم تھے جو ملازمت سے ہٹنے پر پانے کے بعد
 مضافاتی شہر میں آباد ہو گئے ہیں۔ صفیہ شمیم کے نام سے اردو ادب سے شغف رکھنے
 والا ہر آدمی واقف ہے۔ اس دور کی خاتون شعراء میں وہ نامور ترین شاعرہ ہیں۔ ان کے
 کلام میں چنگی، شیرینی، رس اور گھلاوٹ ہے۔ انہوں نے راولپنڈی سے ایک ادبی جریدہ "صبح نو"
 کے نام سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اس جریدے سے زیادہ زندگی دپائی۔
 صفیہ شمیم کے ساتھ ہی دو اور شاعرات کا ذکر ہونا چاہیے۔ یہ شاعرات ربیع فخری اور
 رشیدہ سمیں ہیں۔ ربیع فخری شعر و ادب پر نہایت گہری نظر رکھتی ہیں۔ اور اپنی شعری اور
 نثری تخلیقات میں بہت زیادہ کدو کاوشیں سے کام لیتی ہیں۔ وہ سالہا سال تک حلقہ ارباب
 ذوق کی محنت معاون رہیں اور نہایت خلوص اور انہماک سے ادبی خدمات سر انجام دیتی رہیں۔
 رشیدہ سمیں شعر میں سستہ مذاق رکھتی ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی
 شعر کہتی ہیں۔ مشاعروں اور ادبی محفلوں میں بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتی ہیں۔
 ریڈیو سے متعلق ایک اور شاعر عطا حسین کلیم ہے۔ مشاعروں میں شریک
 ہونے سے گریز کرتا ہے لیکن محفلِ احباب میں خوب خوب چمکتا ہے۔ نہایت زندہ دل
 اور یارِ باش قسم کا آدمی ہے۔ جس محفل میں ہو گئے اپنی بنلہ سنجیوں سے کشتِ زعفران
 بنائے رکھتا ہے۔ کلیم ہی کی طرح زندہ دل اور بنلہ سنجی شاعر تجلِ صُنین اختر بھی ہے شعر
 گوئی میں اُس کا مذاق سلجھا ہوا ہے۔ زبان و بیان کا خاص خیال رکھتا ہے۔ صنائع اور
 بدائع سے کام لینا جانتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایہام سے شعر میں ایک رنگین کیفیت پیدا
 کر دیتا ہے۔

یہاں ایک اور نوجوان شاعر توصیف تبسم کا ذکر بھی ضروری ہے۔ توصیف
 بھی ۱۹۷۷ء میں راولپنڈی پہنچا۔ اتفاق سے وہ ایک ایسے شعبے میں ملازم ہوا۔
 جی کی کارکردگی کا بڑا مرکز راولپنڈی میں ہے۔ توصیف تبسم غزل میں بڑی محنت

اور فنکارانہ سہولتوں سے کام لیتا ہے اس کے کلام میں فکر اور جذبے کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ اب تو صیغہ تبسم گورڈن کالج راولپنڈی میں پروفیسر ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں دہلی اور اکبر آباد شعرو سخن کے دو بڑے مرکز تھے۔ اکبر آباد کی خاک سے اردو شاعری کے ابتدائی ادوار سے بڑے بڑے شاعر اُٹھتے رہے ہیں نظیر جسے تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سیکسینہ نے اردو زبان کا شہسپہر لکھا ہے۔ اسی شہر کا رہنے والا تھا۔

غالب نے اگرچہ شادی کے بعد اپنی تمام زندگی دہلی میں بسر کی اور غالب دہلوی کے نام سے مشہور ہوا۔ لیکن اس کا مولد و منشاء بھی اکبر آباد ہی تھا۔ دورِ جدید میں سیلاب اکبر آباد سے پائے کے شاعر اور ناقد ہو گزرے ہیں۔ سیلاب کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ان کے دم سے ایک نیا مکتب سخن عالم وجود میں آیا۔ جسے ہم اکبر آبادی مکتب سخن کہتے ہیں۔

پاکستان اور تجارت الگ ہوئے تو اکبر آباد کے بہت سے شعراء راولپنڈی آ پہنچے۔ ان شعراء کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ بعض محفلوں میں ہر طرف اکبر آباد ہی اکبر آباد نظر آتا ہے۔ اکبر آبادی شعراء کے میر کارواں جناب نیر اکبر آبادی ہیں۔ ان کی طبیعت نظم گوئی کی طرف تو کچھ زیادہ مائل نہیں لیکن غزل میں اپنا ایک اسلوب رکھتے ہیں۔ پڑھنے کا انداز بھی ان کا اپنا ہے۔ کلام میں روایتی تغزل کا رنگ چوکھا ہے۔ لیکن روایتی ہونے کے باوجود اس رنگ تغزل میں ایک عجیب کیفیت اور ایک خاص قسم کا سرور ہوتا ہے۔

نیر اکبر آبادی کا خاندان شاعروں کا خاندان ہے۔ ان کے تقریباً سبھی صاحبزادے شعرو سخن سے شغف رکھتے ہیں۔ لیکن مہر اکبر آبادی اور نیساں اکبر آبادی ادبی حلقوں میں زیادہ متعارف ہیں۔ نظم اکبر آبادی، مضطر اکبر آبادی اور ظفر اکبر آبادی، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے۔ اسی مکتب سخن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکبر آباد کے شعراء کی ایک خصوصیت

یہ بھی ہے کہ ان میں سے تقریباً سبھی شاعر ترم سے پڑھتے ہیں اور بعض تو واقعتاً خوب پڑھتے ہیں۔

گجر آبادی گروپ کا حریف میرٹھی گروپ ہے۔ اس گروپ کے شعرا نے ایک مجلس قائم کی ہوئی ہے۔ جس کا نام روح الادب ہے۔ اس مجلس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں دوسری مجلسیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ وہاں یہ مجلس ایسی قائم ہوتی ہے کہ قائم چلی جا رہی ہے۔ اس زمانے میں طرح پر لکھنا کاربیکاراں سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ”روح الادب“ والے عام طور پر طرحی مشاعرے کرتے ہیں۔ سال میں ایک بڑی تقریب بھی اہل مجلس کے زیر اہتمام ہوتی ہے۔ اس بڑی تقریب میں عام طور پر یوم غالب منایا جاتا ہے۔ اس انجمن کے صدر جدت میرٹھی اور سیکرٹری نسیم میرٹھی ہیں۔

میرٹھ اور اکبر آباد سے تو شاعر حضرات گروہ درگروہ راولپنڈی پہنچے ہیں۔ لیکن بعض دوسرے شہروں سے ایک ایک، دو دو شعراء یا باری آمد ہوتی۔ مثلاً لدھیانے سے آنے والے خاور لدھیانوی اور صادق نیازی اچھا کہنے والوں میں سے ہیں۔ صادق نیازی، نیاز فتحپوری کاشاگر دہے اور فن اور عروض کے سلسلے میں اس کا مطالعہ وسیع ہے۔ ہوشیار پور سے آنے والے اختر ہوشیار پوری شاعر ہیں اور قمر انشا پر طراز، اختر بڑا پور گور شاعر ہے۔ اور بعض اوقات تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص اگر کچھ وقت اپنے ذریعہ معاش یعنی وکالت پر بھی صرف کرتا ہے۔ تو اتنے شعر کیونکر لکھ لیتا ہے۔ اور اگر تمام وقت شاعری کی تلاش کرتا ہے تو کھانا کہاں سے ہے۔ اگر اقامت کرنے والے تخلص محض برائے وزن بیت رکھا ہوا ہے ورنہ شاعری سے اسے اسی قدر تعلق ہے کہ وہ ایک شاعر کا سمجھا جاتا ہے۔ البتہ ہلکے پھلکے مضامین لکھنے میں وہ صاحب فن ہے۔

یہاں ایک اور گروپ کا ذکر خالی از لطف نہ ہو گا۔ یہ گروپ چار مزاج نگاروں یعنی ضمیر مجتبیٰ، نذیر احمد شیخ، زری صدیقی، اور ڈاکٹر گزن پر مشتمل تھا۔

ضمیر جعفری کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ نذیر احمد شیخ مشرقی پنجاب کے مہاجر ہیں۔ ملازمت کے سلسلے میں راولپنڈی پہنچے اور یہیں کے ہو رہے۔ مزاحیہ شاعری میں ان کا کلام بہت اونچا ہے۔ اپنے اشعار میں تلکحات سے بہت کام لیتے ہیں۔ نغموں کے عنوانات تک میں مزاح پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً مثنوی "خیر و شر" کے جواب میں انہوں نے مثنوی "خیر و شر" لکھی ہے۔

رزمی صدیقی میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں پہنچے۔ پہلے مختلف دفاتر میں کام کرتے رہے اور آخر کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے۔ ڈاکٹر گزن کا اصلی نام غضنفر علی ہے۔ لیکن اپنے تخلص سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا کلام مجید اور کے "نمک دان" میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

یہاں تک تو لو پھٹو ہار کے صرف ان ادباء اور شعراء کا تذکرہ ہوا ہے جو راولپنڈی میں پیدا ہوئے یا راولپنڈی میں آئے۔ لیکن تمام علاقہ پوٹھوہار کے شاعروں، اورادیوں کا جائزہ لئے بغیر یہ ادبی تذکرہ نامکمل رہے گا۔ اس لئے ہم مختصر راولپنڈی سے باہر کے شعراء اور ادباء کا حال بھی لکھتے ہیں۔

مری میں گزشتہ پچاس ساٹھ برس کے عرصے میں صرف دو چار اہل قلم پیدا ہوئے ہیں۔ ان لوگوں میں زمانے کے اعتبار سے صادق بخاری کو اولیت حاصل ہے۔ وہ گھوڑا گلی کے رہنے والے ہیں۔ اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں پیدا ہوئے۔ جس زمانے میں راقم الحروف سکول کے بچے درجوں میں پڑھتا تھا، بخاری صاحب ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔

نذیر احمد شیخ کے مزاحیہ کلام کا انتخاب "حرف بکاش" کے نام سے "آئینہ ادب" لاہور نے شائع کیا ہے۔

یہ مجموعہ اردو کی مزاحیہ شاعری میں ایک حسین اضافہ ہے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں نذیر احمد شیخ کا انتقال ہو گیا۔

سے انیسویں کر اب رزمی صدیقی مرحوم ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر گزن بھی۔

صادق بخاری نے اپنی زندگی میں بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وہ نامہ شناسی روزگار اور ستم طراز ہی ابتلائے روزگار کے تمام عمر شاکی رہے اور یہ شکایت بسا اوقات تند و تیز لہجہ اختیار کر کے ہجو گوئی کا روپ دھار لیتی رہی۔

مری میں ادبی سرگرمیوں کے آغاز کا سہرا اربان فارانی کے سر ہے۔ اس باہمت شخص نے ۱۹۲۰ء میں جرم ادب کی بنیاد رکھی۔ اور اس جرم کے زیر اہتمام مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں جب اور لوگ بھی شعرو سخن کی محفلوں کی طرف مائل ہوئے تو جرم ادب کے نام بدلتے رہے اور اس کی جگہ کبھی انجمن ترقی اردو قائم ہوئی، کبھی مجلس علم و ادب، پھر اس شہر میں مری لٹریٹری سرکل کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم ہے۔ ان تمام ادبی انجمنوں میں اربان فارانی کو ہمیشہ کلیدی حیثیت حاصل رہی۔

ادبی انجمنوں کے اس سلسلے نے مری کے رہنے والے کئی شاعر طبع نوجوانوں کو شعرو ادب کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ طارق جلیل، نسیم شائیں پوری اور فضل حسین مظہر کی طبیعتوں کے جوہر نمودار ہوئے۔ جلیل اور مظہر تو رہنے والے ہی مری کے ہیں۔ نسیم شائیں پوری ملازمت کے سلسلے میں اغلباً ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء میں مری پہنچا۔ اور اس کے بعد ایک طویل عرصہ مری میں رہنے سے وہ ایک لحاظ سے اب اہل مری میں شمار ہوتا ہے۔

اس کو ہستانی سرزمین میں دو اچھے افسانہ نگار بھی ابھرے ہیں۔ یہ دونوں کاشمیری ہیں۔ ایک کا نام لطیف اور دوسرے کا حمید ہے۔ دونوں تقریباً ہم سن ہیں اور دونوں کی افسانہ نگاری کے آغاز کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ لطیف کاشمیری کے افسانوں کا ایک مجموعہ ”آداس کرئیں“ اور ایک بہت اچھا ناول ”غزالہ“ شائع ہو چکے ہیں۔ حمید کاشمیری کے افسانوں کا ایک نہایت عمدہ مجموعہ ”دیواریں“ شائع ہو کر ملک بھر کے ادبی حلقوں میں خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔

مری کی ادبی شخصیتوں میں ڈاکٹر محمد ریاض کا شمار ملک کے نامور اہل قلم میں ہوتا

ہے۔ وہ گہل کے رہنے والے ہیں اور انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی میں حاصل کی اور اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول مری سے میٹرک کیا۔ علم کا شوق انہیں کشاں کشاں کراچی لے گیا۔ جہاں ایم اے تک تعلیم مکمل کی۔ ایم اے میں انہوں نے فارسی زبان اور ادب میں خصوصیت حاصل کی اور پھر تہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ وہ علامہ اقبال کے شیدائوں میں سے ہیں۔ ان کے مقالات ملک اور بیرون ملک کے جرائد میں شائع ہوتے ہیں۔ وہ اردو زبان کے نامور مصنف ہیں اور ان کی کئی کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔

یہاں دامن کوہسار کی زہنے والی ایک حنائی ادیبہ کا ذکر بھی نہایت ضروری ہے۔ ان کا اسم گرامی رشیدہ اختر شمع ہے۔ وہ ایک عالی خاندان کی چشم و چراغ اور ایک روشن و ماع باپ کی روشن و ماع بیٹی ہیں۔ ان کے کئی ناولٹ شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے "شمع کے آئینے" خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ ان کے انداز تحریر میں سوز و گداز کی فراوانی ہے۔ رشیدہ اختر کی سب سے چھوٹی بہن ثریا جبین بھی ایک نامور ادیبہ بن چکی ہیں۔ پوٹو ہار کے دل یعنی گوجران کی خاک سے کوئی نامی ادیب نہیں اٹھا۔ کسی زمانے میں مرزا کرم الہی خاموشی ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے۔ ایک اور نوجوان عبدالرشید ارشد طنز و مزاح کے میدان میں ابھرا۔ لیکن جلد ہی لکڑی کے مجنوں میں ڈوب گیا۔ گوجران کے دیہات سے تعلق رکھنے والے ایک قدرے بزرگ قسم کے شاعر شیر علی تاباں ہیں۔ جن کا اصلاحی انداز کا کلام کبھی کبھار اخبارات میں اب بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کے علاوہ محمد یونس، عنایت اللہ، اور نور رشید عالم بھی جہاں اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ اور آج کل قلمیوں صحافت کے میدان میں ہیں۔ عنایت اللہ کی تحریریں ہفت روزہ "قذیل" میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔

گوجران کا علاقہ زرعی اعتبار سے جتنا زرخیز ہے اُنہی اعتبار سے اتنا ہی بنجر ہے۔ اب تو اس تحصیل میں کئی ہائی اسکول کھل چکے ہیں۔ اور شہر میں ایک انٹر میڈیٹ کالج

لے ان کے افسانوں کے دو مجموعے "اداس نگاہیں" اور "تہنا پھول" شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۵۰ء میں ان کی ایک عمدہ کتاب میں موت ڈھونڈتی ہوں زمین مجاز میں "شائع ہوئی ہے۔ یہ ان کے سفرِ حج کی خوبصورت روایت ہے۔

میں تعلیم ہو چکا ہے۔ اس لئے لوگوں میں تعلیم کا شوق بڑھ رہا ہے۔ لیکن پاکستان
بہت سے پہلے شہر میں ایک اسلامیہ ہائی سکول ہوا کرتا تھا۔ اور ایک خالصہ ہائی سکول۔ باقی
علاقے میں کہیں کہیں مڈل سکول پائے جاتے تھے۔

گیانہ اس تحصیل کا قریبی اور مشہور قصبہ ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد کچھ عرصے
تک یہ تحصیل کا صدر مقام بھی رہا۔ یہاں ایک فارسی مڈل سکول بڑے عرصے سے قائم
تھا۔ اس سکول سے نوجوان ورنیکلر مڈل پاس کر کے مدرس اور پٹواری بنا کر تھے پٹنا چور
اس قصبے کے مدرس مبلغ بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ نیم تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان
لوگوں میں ادب کا ذوق اور شعور کم ہی ملتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اس شہر میں
کوئی ادبی انجمن وجود میں نہیں آئی۔ اور حد یہ ہے کہ یہاں پر تاریخ میں پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء
میں ایک مشاعرہ ہوا۔

گوجر خان کے ایک قریبی گاؤں کے رہنے والے جناب محمد فاضل ہیں
فاضل صاحب بھی ابتدائی تعلیم کے بعد حصول روزگار کے سلسلے میں لاہور
نکل گئے۔ یہاں وہ مختلف ہنگامی جرائد میں کام کرتے رہے۔ مولانا سالک اور چراغ حسن حسرت
سے انہیں قریبی تعلق رہا۔ ابھی تک ان کی کوئی مستقل تصنیف تو سامنے نہیں آئی۔ لیکن
ان کے مضامین مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

صحافت کے میدان میں اس علاقہ کے جس شخص نے سب سے زیادہ کام کیا وہ
راجہ امیر زمان خان ہیں جن کا قلمی نام فائق کامران ہے۔ انہوں نے راولپنڈی سے سب
سے پہلا روزنامہ ”ترجمان“ ۱۹۴۷ء میں جاری کیا تھا لیکن یہ اخبار سر ملے کی کمی کی نذر
ہو گیا۔ بعد میں وہ اخبار ”شہنشاہ“ اور اخبار ”آفاق“ کے عملہ ادارت میں شامل رہے۔
وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ”اپنا راستہ خود بناؤ“ ”خود اعتمادی“ ”کامیابی
اور مغربی پاکستان ایک تہذیب وحدت“ کے علاوہ ایک ناول ”اور طوفان تمم گیا“ بھی

مثال ہے۔ کئی سال تک وہ جہلم کے ہفت روزہ ”نئی زندگی“ کے ایڈیٹر بھی رہے۔ آجکل راولپنڈی میں غاموشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

فائق کامران سے بہت پہلے چکوال کے راجہ غلام حسین صحافت کے میدان میں نمایاں کام کر چکے تھے۔ اور انہوں نے بہت زیادہ نام بھی حاصل کیا تھا۔ وہ اس میدان میں رئیس الامار مولانا محمد علی جوہر کے رفیق کار اور ان کے اختیار کامریہ کے ایڈیٹر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کی طرح نہایت عمدہ ایڈیٹریں لکھتے تھے۔ اور ان کے قلم میں بھی اپنے قائد کے قلم جیسا زور تھا۔

ہماری ملکی صحافت کی بدترستی سے آسمان صحافت کا یہ ستارا ستور سے محروم کی چمک دمک کے بعد ہمیشہ کے لئے غمرو بہ ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر نے ان کی وفات پر مرثیہ لکھا تھا جن کا ایک شعر غالباً اس طرح تھا کہ

تم کو مرنا نہ تھا غلام حسین
کوئی دن اور ابھی بچے ہو تے

گوجران کے مقابلے میں چکوال کا علاقہ ادبی اعتبار سے نہایت زرخیز واقع ہوا ہے۔ یہ خطہ شعر آفرین اور شاعر پرور ہے۔ حالانکہ یہاں نہ قدرتی مناظر ایسے خوب ہیں نہ انسانی حسن و جمال کی ایسی فراوانی کہ شعر کہنے کی تحریک ہو سکے۔ اس کے باوجود اس خاک سے اتنے نغمہ گو شاعر اور سخن نگار نائید پیدا ہوئے ہیں کہ اتنے اس جیسے کسی اور دور افتادہ تحصیل مقام میں پیدا نہیں ہوئے۔

مؤبر اقل کے شعراء میں بسمل کے علاوہ ادیب چکوالی، اختر چکوالی، اور طالب چکوالی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ادیب چکوالی سرکاری ملازمت کے باوجود ہمیشہ چکوال ہی میں رہے۔ ان سے ملنے کے بعد شاعر ہونے کا کم اور اچھا انسان سے ہونے کا آثار زیادہ ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعری میں غزل اور نظم کے مقابلے میں

نعت پر زیادہ توجہ دی ہے۔ کسی زمانے میں انہوں نے ”موجِ نور“ کے نام سے نعتوں کا ایک مجموعہ تالیف کیا تھا۔ جس میں برصغیر ہندوپاک کے مشہور شعراء کا نعتیہ کلام جمع ہے۔ اثرِ چکوال آج سے بیس پچیس برس پہلے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت رکھتا تھا، آج کل بالکل خاموش ہو چکا ہے اور چکوال سے دور معنوی اور ادبی دولت کے مقابلے میں مادی دولتوں کی فراہمی میں مصروف ہے۔

طالبِ چکوالی کا نام منور لعل تھا۔ نہایت خوشی گو اور خوش فکر شاعر تھا۔ ذکاوت اللہ لعل کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ کثر اور متعصب ہندو خاندان میں پیدا ہوا۔ لیکن نہایت وسیع القلب اور غیر متعصب انسان تھا۔

اپنی جوانی کے زمانے میں ان شعراء نے چکوال میں ایک ادبی حلقہ بھی قائم کیا ہوا تھا جس کے اہتمام سے شعروادب کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ بعد کے زمانے میں الزعلی اور ریاضِ چشتی نے اس دور افتادہ علاقے کے ادبی آفتاب کو روشن کئے رکھا۔ الزعلی اور فارسی زبان کے پروفیسر ہیں۔ اس لئے اردو سے زیادہ فارسی گوئی کی طرف مائل ہیں۔ ریاضِ چشتی فنِ شاعری میں اتنے سلیجے ہوئے اور اتنے پختہ ہیں کہ ان کا کلام سن کر حیرت ہوتی ہے۔ اگر یہ شخص کسی بڑے ادبی مرکز میں ہوتا تو آج اس کا شمار ملک کے مشہور شعراء میں ہوتا۔

نثر نگاروں میں حمید عرفانی اور غلام سرور خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں حضرات فارسی ادب کے فاضل ہیں اور دونوں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے بعد ملک کے ادبی حلقوں میں نام پانگے ہیں۔ ڈاکٹر غلام سرور آجکل کراچی یونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر ہیں۔ حمید عرفانی کچھ عرصہ لیکچرار رہنے کے بعد ایران چلے گئے تھے۔ جہاں علمی

سلسلہ ڈاکٹر عبد الحمید عرفانی چکوال کے باشندے نہیں۔ انہوں نے طالب علمی کا زمانہ یہاں گزارا جس کی وجہ سے ان کا ذکر آیا ہے۔ ان کا انضیال چکوال میں ہے۔

منازل طے کرنے کے بعد وہ پاکستان واپس آئے اور مجلہ "ہلال" کے ایڈیٹر رہے۔ پھر وہ چھترہراں میں پاکستانی سفارتخانے کے پریس اتاشی ہیں۔ ایران کے علمی حلقوں میں ان کی بڑی قدر ہے۔ وہ پہلے پاکستانی ہیں جن کی فارسی تصنیفات ایران میں شائع ہوئی ہیں۔

اس چھوٹے سے شہر سے ایک خالصتاً ادبی ماہنامہ بھی شائع ہوتا ہے۔ اس ماہنامے کا نام "ادبیات" ہے۔ آج کل کے زمانے میں جب کہ بڑے بڑے شہروں سے اور بڑے بڑے جنادری اہل قلم کے زیر ادا رت شائع ہونے والے ادبی جرائد دم توڑ رہے ہیں، پکوال جیسے مقام سے "ادبیات" کا زندہ رہنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ یہ معجزہ ریاض چشتی کی ہمت اور شعروادب سے بے پناہ لگن کا مرئوں منت ہے۔

۴۔ جکل اس شہر میں لکھنے والوں کا ایک حلقہ موجود ہے۔ اس حلقے میں ریاض چشتی کے علاوہ افتخار ناطق، شورش ملک، گوہر گوایاری، صدیق ساجد، مشتاق قاضی، جمیل جہاں، جمیل ہاشمی اور ماجد صدیقی شامل ہیں۔ افتخار ناطق اور گوہر گوایاری صرف غزل کہتے ہیں۔ اور صدیق ساجد اور جمیل ہاشمی غزل اور نظم دونوں، مشتاق قاضی افغانی لگا رہے۔ اور آہستہ آہستہ ادبی حلقوں میں اپنا نام پیدا کرتا چلا جا رہا ہے۔ شورش ملک صحافت کے میدان میں لیکل گیا ہے۔ جمیل ہاشمی اور ماجد صدیقی صرف لگا شعر کے پرستار ہیں۔ ماجد صدیقی خاص پکوال کا رہنے والا نہیں بلکہ پکوال سے پرکے "ونہار" کے علاقے کا باشندہ ہے۔ ونہار کے علاقے کے لوگ تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے انتہائی پسماندہ ہیں اور اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لڑائی بھڑائی اور سرمچٹول میں گزارتے ہیں۔ اس حلقے سے ایک شاعر طبع انسان کا پیدا ہونا کسی عجب سے کم نہیں۔ ماجد آردو شاعری کے علاوہ پنجابی شاعری سے بھی متبحر

۔ سچے ادبیات میں چار سال تک جاری رہا۔

رکھتا ہے۔ اور قیاس بھی ہے کہ اس کا نام اس کی اردو شاعری سے زیادہ اس کی پنجابی شاعری سے زندہ رہے گا۔ جمیل جہم اب جمیل یوسف کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے گذشتہ دس پندرہ برس کے دوران شاعری میں بڑی ترقی کی ہے۔ اور اس وقت تک اس کے تین مجموعے شائع ہو کر دنیا کے ادب میں ان کے لئے مقام پیدا کر چکے ہیں۔ اس نے نثر میں بھی کام کیا ہے اور اس کی کتاب "بابر سے بہادر شاہ ظفر تک" اردو کے تواریخی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

گورنمنٹ کالج چکوال سے جہاں نوجوان مردوں نے فیض حاصل کیا۔ وہاں خواتین بھی بہرہ ور ہوئیں۔ ان خواتین میں سے دو کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی نسیم فردوس ہیں جو چکوال ہی کی رہنے والی ہیں اور کالج کے زمانہ سے افسانے لکھا کرتی تھیں جسے اے کرنے کے بعد انہوں نے لاہور سے ایم اے اور پھر جرنلزم کی ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ صحافت کے میدان میں آگئیں اور روزنامہ "مشرق" لاہور سے وابستہ ہوئیں اسی حیثیت میں وہ لندن میں بھی رہیں۔ افسوس کہ انہیں نوجوانی ہی کے زمانے میں بیوگی کا داغ لگا۔ اور اب خاموش زندگی بسر کر رہی ہیں۔

دوسری خاتون زہرہ جبین ہیں۔ انہوں نے بھی ایم اے کیا اور تعلیم و تدریس کے میدان میں داخل ہوئیں۔ ایک عرصہ دراز تک راولپنڈی میں رہیں اور یہاں کی ادبی محفلوں میں حصہ لیتی رہیں۔ انشائیہ اور طنز و مزاح ان کا خاص میدان ہے۔

چکوال کے مقابلے میں جہلم ادبی لحاظ سے بنجر اور سپہماندہ ہے۔ یہاں غفور عابد ایک صاحب ذوق اور بلند ہمت نوجوان ہے اور اس کی بدولت شہر کی ادبی زندگی میں کبھی کبھی ہنگامے کا اہتمام ہو جاتا ہے۔ مشہور مصنف جناب عبداللہ اختر ہندوستان سے ہجرت کر کے جہلم میں آباد ہوئے ہیں۔ لیکن کچھ عمر اور کچھ انداز نظر کے باعث خاموش علمی زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔ البتہ ان کے صاحبزادے کرامت اللہ قمر

ایک خوش گو، رنگیں بیاں اور محفل آرا شاعر ہیں۔ ہجرت کر کے کچھ اور شعراء بھی اس شہر میں وارد ہوئے ہیں۔ جن میں سے سرفراز حسین جوہر لکھنوی کا دم غنیمت ہے۔ مقامی شعراء میں سے ایک نوجوان اختر منیائی کا نام اب سامنے آ رہا ہے۔ اسی طرے ۱۸ قمریشی اور یوسف جہلمی بھی یہاں کے اُسمہرتے ہوئے شاعر ہیں۔

آج سے چند سال پہلے ضامن حیدری بیرون ملک سے واپس آکر جہلم میں فرکشی ہوئے تو اس شہر کی ادبی زندگی میں بڑی رونق ہو گئی۔ ضامن شاعر بھی خوب کہتے تھے۔ مگر پڑھتے تو ایسا تھے کہ سماں باندھ دیتے تھے۔ تخت اللفظ پڑھنے میں انہیں بہت ملکہ حاصل تھا افسوس کہ کچھ عرصہ پہلے دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

جہلم کے مولانا غلام اعظم ایک بڑی فاضل شخصیت ہیں۔ فارسی، اردو پنجابی تینوں زبانوں پر بڑی دیکھ بھال رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال کے شیدائی اور فکر اقبال کے مبلغ ہیں۔ اُن کے علاوہ سید اماد ہدانی، پروفیسر حسن عسکری اور تنویر سہرا کا شمار بھی معروف شعراء میں ہوتا ہے۔ پروفیسر غلام کبریا راحل پُرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ مگر عمر بھر گوشہ گزیں رہے۔ نثر نگاروں میں پروفیسر سید سجاد جعفری بڑی توانا نثر لکھتے ہیں اور اُن کے تحقیقی اور ادبی مقالات اخبارات اور مجلہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سجاد جعفری کا تعلق چک عبدالخالق کے مشہور زمانہ خاندان سادات سے ہے۔ عزیز دہلوی آرٹسٹ ہیں مگر شعر بھی کہتے ہیں۔

کیمبل پور کے دورِ جدید کے شعراء میں سے منظور عارف کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس مردِ قلندر کی افتادِ طبع مکمل طور پر شاعرانہ واقع ہوئی ہے۔ وکیل ہونے کے باوجود اُسے اپنے پیشے سے طبعاً لگاؤ نہیں۔ شعروشاعری کی دُنیا میں مست رہتا ہے۔ اردو شاعری کے علاوہ پنجابی اور خاص طور پر پچھلاچی زبان میں اُس نے بڑی پیاری نظمیں کہی ہیں۔

کیمبل پور میں گورنمنٹ کالج ایک عرصہ دراز سے قائم ہے۔ سید ضمیر جعفری اسی کالج کے ایک پرنسپل طالب علم ہیں۔ اس کالج نے اس شہر کی علمی فضا کو سنوارنے اور نوجوان صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اتفاق سے یہاں بڑے اچھے اچھے اساتذہ عرصہ دراز تک کام کرتے رہے جن کے دم قدم سے طلباء میں علم و ادب کی لگن پیدا ہوتی رہی۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر غلام جیلانی برق، پرنسپل فضل احمد قسری پرنسپل اشفاق علی خاں اور پروفیسر محمد عثمان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اس کالج میں آجکل پروفیسر سعد اللہ کلیم کام کر رہے ہیں۔ جو ایک سچے ہوئے شاعر اور ادیب ہیں۔ یہیں غلام محمد نذر صابری بھی مقیم ہیں جو عرصہ دراز سے کالج لائبریری کی قدر و قیمت بڑھانے میں مصروف ہیں۔ نذر صابری درویش صفت انسان ہیں۔ فارسی زبان کے ایم اے اور اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں تصوف کی چاشنی ملتی ہے۔ دیہاتی علاقہ سے تعلق رکھنے والے ایک پُرگو شاعر صابر مٹھیا لوی ہیں۔ یہ شخص مٹھیاں نامی گاؤں کا رہنے والا ہے اور اس نے اپنی تمام عمر دیہات ہی میں گزار دی ہے۔ اس لئے ادبی حلقوں میں زیادہ متعارف نہیں ہوا۔ تاہم اُس کا کلام روزناموں اور ہفت روزہ جرائد میں دیکھنے میں آتا رہتا ہے۔

کیمبل پور کے دور جدید کے اہل قلم جن میں انوار فیروز، منو بھائی، خاور غنی و قاربن الہی، شفقت تنویر مرزا، فتح محمد ملک اور عزیزہ ہمدانی کے ناموں سے اہل علم بخوبی آشنا ہیں۔ سب کے سب گورنمنٹ کالج ہی کے چہمہ علم و ادب سے سیراب ہوئے ہیں۔ انوار فیروز، قاربن الہی، شفقت تنویر مرزا اور فتح محمد ملک پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے ہیں۔ ان میں سے قاربن الہی اور فتح محمد ملک اب پنجاب کالجوں میں اردو ادب کی تدریس پر مامور ہیں۔ فتح محمد ملک نہایت سچے

ہوتے ذہن کا مالک ہے اور اُس نے گزشتہ چند برسوں کے اندر ہی اپنے آپ کو ایک اعلیٰ پائے کا نقاد تسلیم کرا لیا ہے۔ انوار فیروز شہقت تنویر مرزا اور مقبول صحافت کے میدان میں نکل گئے ہیں اور نہایت کامیاب صحافی مانے جاتے ہیں۔ غادر رضوی البتہ بالکل غیر ادبی قسم کی ملازمت میں پھنسا ہوا ہے لیکن پھر بھی تخلیق ادب کا فریضہ بخوبی سرانجام دے رہا ہے۔ یہ ہونہار لوجوان اگر کیسی علمی یا ادبی کام میں لگ جاتا تو اُس کے ذات سے شعروادب کو بہت فائدہ پہنچتا۔

پوٹھوہار کے علاقہ میں گزشتہ پانچ چھ سال کے عرصہ میں کئی نام اُبھرے ہیں ان میں سے جس نام کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی ہے وہ کرنل محمد قاسم ہے۔ جن کی مزاحیہ انداز میں لکھی ہوئی ایک ہی کتاب ”جنگ آمد“ نے ادبی حلقوں کو حیران کر دیا ہے۔ اُن کا انداز بیان اتنا شگفتہ ہے کہ ایک فقرے پر بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ کرنل صاحب چکوال کے مردم خیز خط سے ہیں۔ اسی علاقہ کے پروفیسر انور بیگ اعوان، میجر محمد صدیقی سالک اور باغ حسین کمال بھی ہیں۔ ان صاحب فارسی زبان کے استاد اور اردو زبان کے انشا پرداز ہیں۔ طبیعت میں تحقیق اور جستجو کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ علاقہ دھن کے ادب اور ثقافت کے متعلق اُن کی ایک نہایت قابل قدر تصنیف حال ہی میں شائع ہوئی ہے صدیقی سالک فوج میں ہیں لیکن کام لکھنے پڑھنے ہی کا ہے۔ افتاد طبع ادیبانہ اور مدح

سہ صدیقی سالک موضوع منگلیا تحصیل کھاریاں ضلع گجرات کے رہنے والے ہیں۔ یہ گاؤں پوٹھوہار کے علاقہ سے بالکل ملحق ہے گزشتہ چند سال کے دوران سالک ادبی میدان میں بڑی فتوحات حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کی تین کتابیں ”ہم یاراں دوزخ“ ”WITNESS TO SURRENDER“ اور ”میں نے ٹھہا کر ٹھہرتے دیکھا“ شائع ہو چکی ہیں۔ ”وٹننس ٹو سرینڈر“ سقوط ڈھاکہ کی دلداز داستان ہے اور بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس وقت سالک کرنل کے عہدہ پر فائز ہیں۔

ادبوں سے ہے۔ مزاحیہ نثر لکھنے میں مشاق ہوتے چلے رہے ہیں۔ باغ حسین کمال ایک امیگر تاجر اور جوان ادیب ہے۔ ایم اے کر چکا ہے اور محکمہ تعلیم سے منسلک ہے اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں پنجابی زبان کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی ہے۔ آج کل تعوف کی راہ میں نکل گیا ہے۔

جب سے انٹر میڈیٹ کے درجہ تک اردو زبان کو ایک لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔ اس کی قدر و قیمت اور اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ ایم۔ اے اردو کلاسز کا جہاں کہیں اجراء ہوا۔ طلباء اور طالبات حقوق درجوں میں داخلہ لینے لگے۔ راولپنڈی میں اس شہر کی قدیم درس گاہ گارڈن کالج نے اس میدان میں اولیت حاصل کی۔ اور اس درس گاہ سے اس وقت تک سیکڑوں طالبات اور طلباء اردو میں ایم اے کر چکے ہیں بلکہ اس وقت اس رجمن کے مردانہ اور زنانہ کالجوں میں اردو کے لیکچرار زیادہ تر اسی کالج کے پرنسپل یا پروفیسر ہیں۔ یہ سب کے سب پروفیسر صفی الدین دانش کے شاگرد ہیں۔ دانش صاحب ایک نہایت فاضل اور باکمال استاد ہونے کے علاوہ ایک اچھے شاعر اور ادیب بھی ہیں اور ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ دانش صاحب کے وجود سے گارڈن کالج حقیقی معنوں میں دانش گاہ ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منلج راولپنڈی کی چوتھی تحصیل کھوٹہ کا بھی کچھ ذکر کر دیا جائے۔ کھوٹہ کا علاقہ بنگلہ جوسپا ہیوں کا گھر ہے اور اس کے ہزاروں افراد افواج پاکستان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ہزاروں ایسے ہیں جو اپنی خدمات کے معاوضہ میں پنشن پارہے ہیں۔ فوجی روایات کی وجہ سے یہاں شعروادب کا کچھ ایسا چرچا نہیں۔ تاہم اسی خاک سے راجہ حسن اختر مرحوم جیسے فاضل انسان پیدا ہوئے جو علامہ اقبال کے نہایت ہی چہیتے نیاز مندوں میں سے تھے سرکاری ملازمت

میں ہوتے ہوئے بھی وہ تحریک پاکستان کی صفِ اول کے مجاہدین میں رہے اور ان دنوں انہوں نے حسن آفاقی اور کوہستانی کے قلمی ناموں سے نوائے وقت اور دوسرے جریدہ میں بیش بہا مضامین لکھے۔ اپنی عمر کے آخری ایام میں موصوف نے پاکستان کی سیاسی زندگی میں اہم مقام حاصل کیا لیکن افسوس کہ عمر نے وقانہ کی۔ اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو وہ اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رخصت ہوئے۔ ان کی وفات کے دوسرے سال ان کے فرزند میجر مسعود اختر جنگِ ہندوستان میں شہید ہوئے۔

راجہ صاحب کے ایک صاحبزادے محمود اختر کی آتی شعر و ادب سے بڑا شغف رکھتے ہیں۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں اور کبھی کبھی نثری مضامین بھی لکھتے ہیں۔ وہ ریجنل رائٹرز گلڈ کی مجلسِ عاملہ کے رکن اور راولپنڈی سب ریجن کے سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ محمود اختر کے بڑے بھائی کرنل ظہور اختر کی آتی پوٹھوہاری تھان میں خوبصورت شاعری کرتے ہیں۔ اب گلبرگیاں کے مقام سے پوٹھوہاری ہجے کے نہایت جاندار

پچھلے چند سال کے دوران راولپنڈی میں جن نئے شعراء اور ادیبوں نے شعر و ادب کے میدان میں قدم بڑھایا ہے۔ ان میں مرتضیٰ برلاس، اختر امام رضوی، نثار ناسک، سلطان رشک، سبط احمد، شہید امجد، جلیل عالی اور سرور کامران نمایاں ہیں۔ اختر امام رضوی، جلیل عالی اور نثار ناسک اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ رشید نثار، مشتاق قمر اور باقر علیم ذرا پہلے کے لکھنے والوں میں سے ہیں جبکہ افضل منہاس، قمر عیسیٰ، غلام رسول طارق، سرور بانالوی، سرور جہانپوری اور منصور قیصر کی ادبی عمر ان سے بھی زیادہ ہے۔ کہکشاں ملک جو منصور قیصر کی ہمسر ہیں۔ پنجابی زبان میں عمدہ افسانے لکھتی ہیں۔ افضل منہاس کی غزلوں کا ایک مجموعہ "روشنی کے زخم" نام سے چھپ چکا ہے۔ تازہ واردانِ ادب میں عظیم الوقار فرخان، اقبال بخت

بلکہ افسوس کہ محمود اختر کی آتی بھی وفات پانچے ہیں۔ قمر عیسیٰ کو رباعی کہنے میں خاصی دستبرد ہے۔

فیاض گورکھپوری — ان کا گورکھپور راولپنڈی کے قریب واقع ہے —
 حسن عباس رضا، حسن سجاد، بلال مصطفیٰ، اسد منظور، شمس، نوید النظر، عبدالباقی باقی،
 اور عبدالباری رانا ہیں۔ یہ سب کے سب نوجوان گورنمنٹ کالج راولپنڈی کے پڑانے
 طالب علم ہیں۔

اس عرصہ میں جو نوآین ادبی حلقوں میں متعارف ہوئی ہیں ان میں جیلہ شاہین، نجمہ
 محمود، رباب عائشہ، ترغین حنا، شمیم اکرام الحق اور رضیہ شفیق رضی کے نام خصوصی طور
 پر قابل ذکر ہیں۔ جیلہ شاہین سی، بی کالج میں پروفیسر ہیں اور ادب میں بڑی سوجھ
 بوجھ کی مالک ہیں۔ ان کے تنقیدی مقالات اور انشائیہ علمی محفلوں میں بڑی توجہ سے سنے
 جاتے ہیں۔ نجمہ محمود بنیادی طور پر افسانہ نگار تھیں لیکن صحافت کے میدان میں نکل گئی ہیں۔
 رضیہ شفیق رضی ایک نہایت ہر نہار شاعرہ تھیں اس نے انٹر میڈیٹ گورنمنٹ کالج
 مری سے کیا اور مہر گارڈن کالج راولپنڈی میں پڑھنے لگی۔ کالج میں پہلے سال ہی اس نے
 بطور شاعر اپنے آپ کو منوانا شروع کر دیا تھا۔ بی۔ اے کے آخری سال تک تو وہ
 راولپنڈی کی سرکردہ شاعرات میں شمار ہونے لگی تھیں۔ افسوس کہ ۱۹۶۸ء کے آغاز
 میں وہ انٹر کالجیٹ مشاعروں میں شرکت کے لئے راولپنڈی سے روانہ ہوئی اور
 لاہور، لائلپور اور کیمبل پور کے کالجوں میں اپنی دھاک بٹھا کر راولپنڈی واپس پہنچی تو
 ایک ناگہانی حادثہ کا شکار ہو گئی۔

خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

آج کل راولپنڈی میں ایک نوجوان شاعرہ ارشاد ارشی بڑی تیزی سے ابھر
 رہی ہے خدا اسے نظر بد سے محفوظ رکھے۔ خیال ہے کہ وہ آگے چل کر شعرو سخن
 میں نام پیدا کرے گی۔ ایسی طرح نورین طلعت بھی شہر کی دنیا میں آگے
 بڑھ رہی ہے۔

خاتون افسانہ نگاروں میں گزشتہ چند سال کے دورانِ مرخصانہ صوبت نے اچھا نام پیدا کیا ہے۔ اس کا شغل زندگی صحافت اور شغلِ ذہنی افسانہ نگاری ہے۔ اس کے افسانوں کا ایک مجموعہ ”کیلے حرف“ شائع ہو چکا ہے۔ ادبی تخلیق کار کے ساتھ ساتھ وہ اچھی ادبی کارکن بھی ہے اور بزمِ کتاب کی روح رواں ہے۔ رخصانہ انوار صولت کی بیٹی ہے۔ جو خود بھی ایک شاعر اور نثر نگار ہیں۔ پاکستان میں آنے کے بعد وہ اب تک میں آباد ہوئے ہیں۔

اس باب کے خاتمہ سے پیشتر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہم نے یہاں صرف ایسے شعراء اور ادباء کا ذکر کیا ہے جو یا تو پوٹھوہار کے قدیم باشندے تھے یا ہجرت کر کے یہاں کے جدید باشندے بن گئے ہیں۔ باقی تمام شعراء اور ادباء جو وقتاً فوقتاً یہاں ملازمت یا کاروبار کے سلسلہ میں رہے ان کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا اور نہ قتیل شفائی، جعفر طائر، فضل احمد کریم فضلی، محبوب خزاں اور کئی دوسرے شعراء کا ذکر لازماً ہوتا۔ ان سب شعراء کے مقابلے میں اب الطاف پرواز صاحب کا حق کہیں زیادہ ہے کہ انہیں راولپنڈی کے شعراء میں شمار کیا جائے کیونکہ وہ تو اب راولپنڈی میں مستقل طور پر بس گئے ہیں۔ اسی طرح انور مسعود بھی جو اردو فانی اور پنجابی زبان کے ممتاز شاعر ہیں۔ اب راولپنڈی کے باشندے بن گئے ہیں اور اچھا لکیر جو آئے د اور پنجابی کے خوش گو شاعر ہیں، یہیں کے شاعروں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

ان شعراء کے علاوہ محمد منشا آوتے جو ایک عرصہ سے اسلام آباد میں مقیم اور حلقہٴ اربابِ ذوقِ اسلام آباد اور بزمِ کتابِ اسلام آباد کے روح رواں ہیں۔ گزشتہ دس سال کے دورانِ افسانہ نگاری کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ”بند مٹھی میں جگنو“ جدید افسانوی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

جدید افسانہ نگاروں میں منظرِ اسلام کا نام بھی معروف اور قابل ذکر ہے۔ وہ لوگ ادب کے بڑے رہنما ہیں اور لوگ ادب کے اعلیٰ فن پاروں کی تلاش اور تجسس میں بڑی محنت سے کام لیتے ہیں۔ لوگ ادب پر ان کی دو کتابیں "لوگ اور پہلی کتاب" اور "لوگ پنجاب" قابل قدر تصانیف ہیں۔

شاعری کے سلسلے میں محترمہ رابعہ نہال کا نام صغیرہ شمیم ملیح آبادی اور شیدائے سلیم سہیل کے ساتھ آنا چاہئے تھا وہ اکبر آباد سے ہجرت کر کے راولپنڈی آئی ہیں۔ غزل ان کا خاص میدان ہے مگر نعت اور مرثیہ بھی لکھتی ہیں۔ خواتین میں خالدہ ملک فوجوان ادیبہ اور افسانہ نگار ہیں وہ راولپنڈی سے اٹھارہ میل دور مشہور گاؤں کلیام اعوان کی رہنے والی ہیں۔ پوٹھوہاری زبان میں ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "زلفاں پھلے پھلے" شائع ہو چکا ہے۔

شاعر خواتین میں ادا جعفری اور پروین سید فنا کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ راولپنڈی اسلام آباد میں ان کا قیام کئی سال رہا لیکن چونکہ ان کی سکونت یہاں مستقل نہیں اس لئے ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

نثر نگاروں میں پچھلے چند سالوں میں جن لوگوں نے خصوصیت سے نام حاصل کیا ہے ان میں حامد بیگ، رحمن شاہ عزیز اور جمیل آذر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ حامد بیگ علاؤ چیمہ کے رہنے والے ہیں اور افسانے لکھتے ہیں۔ رحمن شاہ عزیز عرصہ دراز تک ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہو کر آئے ہیں۔ انشائیے کے علاوہ غزل اور نظم بھی کہتے ہیں جمیل آذر انشائیہ نگار ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں بشیر سیفی، خاور اعجاز، نسیم سحر، اور عبد الحمید کورش بڑی لگن سے شعر گوئی میں مصروف ہیں، ان کے ساتھ سلطان صبر و انیس بھی ہیں جو پانے کہنے والوں میں سے ہیں۔ لیکن درمیان میں کاروباری زندگی میں زیادہ الجھ گئے تھے۔ بشیر سیفی، خاور اعجاز اور نسیم سحر صاحب کتاب ہو چکے ہیں۔

اسلام آباد

قیام پاکستان کے آغاز ہی میں حکومت پاکستان کے ارباب بست و کشاد نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ کراچی محض عارضی دارالحکومت ہے اور اسے عارضی طور پر دارالحکومت اس لئے بنایا گیا ہے کیونکہ ملک میں اور کوئی مقام ایسا نہیں جس میں دارالحکومت کرنے کے کافی گنجائش ہو یا جو محل وقوع، آب و ہوا، مرکزیت اور دفاع کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک موزوں دارالحکومت بن سکتا ہو۔ جلد ہی کراچی میں جو عبوری انتظامات کئے گئے تھے وہ ناکافی اور ناقابل اطمینان ثابت ہونے لگے اور ان کا دارالحکومت بنانے کے لئے مختلف مقامات کی موزونیت پر غور کرتے لگے۔ چنانچہ ماٹھی پور، گذری، یا گڈاپ کے مقام پر نیا دارالحکومت بنانے کی تجاویز زیر غور رہیں۔ ان میں سے گڈاپ کی سکیم سب سے زیادہ تجربہ کار مرکز بنی رہی لیکن بدقسمتی سے اس زمانہ کی حکومتوں کے ناستحکم حالات نے کوئی فیصلہ

نہ ہونے دیا اور نئے دارالحکومت کی تجاویز سر د قانون کی زینت بنتی رہیں۔

۱۹۵۸ء میں جب جنرل محمد ایوب خان نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ

میں لی تو بہت سے دوسرے ملکی اور قومی مسائل کے ساتھ ساتھ دارالحکومت کا مسئلہ

بھی ارباب اختیار کے سامنے آ موجود ہوا۔ پرانی حکومتیں مسائل سے آنکھیں چھڑا کر رہو

رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا کے عاقبت پسندانہ اصول پر وقت کو آگے دھکیلتی چلی

آ رہی تھیں لیکن نئی حکومت میں اتنا دم خم تھا کہ وہ مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

نبرد آزمائی کر سکے۔ چنانچہ اس حکومت نے اپنے قیام کے تین چار مہینے کے اندر ہی

اندر فروری ۱۹۵۹ء میں اس غرض کے لئے ایک کمیشن کا تقرر کر دیا تاکہ وہ دارالحکومت

کی موثر رویت یا غیر مرزویت پر غور کرے اور اگر کراچی دارالحکومت کے لئے ناموزوں

ہو تو نئے دارالحکومت کے لئے مناسب مقام کا تعین کرے۔ اس کمیشن نے محل وقوع، آب

وہوا، پانی اور خوراک کی بہم رسانی اور مواصلات و دفاع کے زالیوں سے تحقیق و تدقیق کرتے

ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ کراچی دارالحکومت کے لئے موزوں مقام نہیں اور ملک کے مختلف

مقامات کا ایک مثالی دارالحکومت بنانے کے لئے بنیادی ضرورتوں کی روشنی میں جائزہ لینے

کے بعد حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ سطح مرتفع پوٹھوہار میں راولپنڈی کے نزدیک

نیا دارالحکومت بنایا جائے جون ۱۹۵۹ء میں حکومت نے کمیشن کی اس تجویز کو منظور

کر لیا اور ستمبر ۱۹۵۹ء میں فیڈرل کیپٹل کمیشن وجود میں آیا تاکہ نیا دارالحکومت بنانے

کے لئے ایک ماسٹر پلان تیار کیا جائے اور اس پلان کے مطابق نئے دارالحکومت کی

تعمیر شروع کی جائے۔

نئے دارالحکومت کا محل وقوع دریائے سندھ کے میدان کے قریب انتہائی

شمال میں ہے۔ نئے دارالحکومت کا رقبہ تین سو اکان مربع میل ہے۔ اور یہ تمام

رقبہ اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ اس کے شمال مشرق اور مغرب میں ایک دوسرے کے

پیچھے بلند ہوتی ہوئی پہاڑیاں ایک ہلال کی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں اور مجوزہ رقبہ کے تقریباً وسط میں نالہ کورنگ پر بندھ باندھ کر ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ جو دن کی روشنی میں تیریا سے چمکتی ہے۔ اگر ایک ہوائی جہاز پر بیٹھ کر بلندی سے دارالحکومت کے اس منظر کو دیکھا جائے تو پہاڑیوں کی گول قوس ہلال اور ان پہاڑیوں کے دامن میں راول جھیل ایک ستارے کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ گویا پاکستان کا دارالحکومت پاکستان کے قومی نشان کی صورت اختیار کئے ہوئے ہے جو قدرتی طور پر زمین پر بن گیا ہے۔ زمین کی سرسبز گویا نشان پاکستان کی سبز زمین ہے۔

نئے دارالحکومت کے نام کا مسئلہ بھی ایک عرصے تک بڑی دلچسپی کا باعث رہا۔ اخبارات میں مختلف لوگوں کی طرف سے مختلف نام تجویز ہوتے رہے۔ مجوزہ نام تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ ان ناموں میں سے موزوں ترین نام منتخب کرنا ناممکن تھا۔ تاہم فروری ۱۹۶۰ء میں حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ نئے دارالحکومت کا نام اسلام آباد رکھا گیا ہے۔ یہ نام اغلباً خود صدر مملکت کا تجویز کردہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہمارے ملک کا نام پاکستان سے بہر اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اس کے دارالحکومت کا نام بھی اسلام آباد سے بہر کوئی نہ ہو سکتا تھا۔

صدر مملکت نے نئے دارالحکومت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ !

”اسلام آباد ہمیشہ سے میرا خواب رہا ہے اور یہ خواب قہ نہیں جو غیر حقیقت پسندانہ اور غیر ضروری قسم کا ہو۔ کسی ملک کا دارالحکومت عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا مرکز اور نقطہ تماس ہوتا ہے اور ان امنگوں اور آرزوؤں کو کسی پہلے سے موجود شہر سے منطبق کرنا غلط ہوتا ہے۔“

دارالحکومت کا لازماً اپنا رنگ اور اپنا مزاج ہونا چاہیے۔ اور یہی منزل

تمام پاک تان کے عوام کی خواہشوں، آسنگوں اور زندگی کا حاصل ہے۔

”دارالحکومت نہ اس نقطہ نظر سے تعمیر کئے جاتے ہیں نہ اس بنا پر

اُن کا وجود قائم رہتا ہے کہ اُن میں افادیت ہوتی ہے۔ افادیت بڑی اہم

چیز ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دارالحکومت کو اس سے بہت بڑی

اہمیتوں کا احاطہ کرنا پڑتا ہے اور ایک طرح سے اُسے ملک کے لوگوں

کے لئے روشنی اور عمل کی جہت متعین کرنی پڑتی ہے اس لئے اُسے

ایسے ماحول میں ہونا چاہیے جو اس مقصد کے حصول کے لئے سازگار ہو۔

برصغیر ہندو پاکستان میں تقریباً دو سو سال کی غلامی کے بعد مسلمانوں کو از سر نو

ایک آزاد مملکت میسر آئی ہے۔ اور اگرچہ یہ مملکت اُس عظیم الشان سلطنت کے تقریباً

پانچویں حصے کے برابر ہے جو اس برصغیر میں تقریباً آٹھ سو سال تک مسلمانوں کے

زیر نگیں رہی۔ پھر بھی اتنی بڑی مملکت جس میں دس کروڑ سے زیادہ انسان رہتے

ہیں۔ ہمارے لئے ایک بہت بڑا عطیہ خداوندی ہے۔ بقول قائد اعظم اس عطیہ

خداوندی نے ہمارے لئے جدوجہد اور سعی و عمل کی وسیع شاہراہیں کھول دی ہیں

اپنے طویل دور حکومت میں مسلمانوں نے برصغیر میں بڑے بڑے عظیم الشان

دارالحکومت بنائے اور دارالحکومتوں کے علاوہ بیسیوں نئے شہر بسائے چنانچہ

دہلی، آگرہ، لکھنؤ، حیدرآباد اور سرنگا پٹم جیسے خوبصورت دارالحکومت اور درجنوں

دوسرے شہر ہمارے تعمیراتی ذوق کے روشن نشانات کے طور پر آج بھی بھارت

میں موجود ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب تاریخی حقیقت ہے کہ آٹھ نو سو سال مسلسل

تمام برصغیر پر حکومت کرنے کے باوجود ایک قوم اور ملت کی حیثیت سے مسلمان

اقلیت ہی میں رہے اور جہاں جہاں انہوں نے اپنے عروج و اقتدار کے دور میں

اپنی محنت، ہنرمندی اور ذہنی بالیدگی کے دیر پا نشانات قائم کئے وہ تقریباً سب سب علاقے آج بھارت کی مملکت میں شامل ہیں۔ اور اب جب کہ اس قوم نے ایک نئی مملکت قائم کی ہے تو اسے اپنی عظمت کے نئے نقوشیں اُسبھارنے کے لئے نئے شہروں کی داغ بیل رکھنی پڑی ہے۔ اسلام آباد انہی نقوش میں سے عظیم ترین نقش ہے جو لو پھو لار کی اس تاریخی سطح پر اُبھرتا، سنورتا اور نکھرتا چلا جا رہا ہے۔

اسلام آباد کو ہم مستقبل کا شہر کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس کی تعمیر و ترقی کے تمام امکانات مستقبل کے دامن سے وابستہ ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے مستقبل اور پاکستان کے مستقبل میں گہرا باہمی تعلق بھی ہے جیسے جیسے پاکستان تعمیر و ترقی کے میدان میں قدم آگے بڑھاتا جائے گا۔ اسلام آباد کی تعمیر و ترقی بھی ہوتی جائے گی۔ اور ہمیں توقع ہے کہ جب پاکستان ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچے گا۔ اُس وقت اسلام آباد دنیا کے عظیم النظیر شہروں میں سے ایک ہوگا۔ اس کے باوجود ہمیں یہ خیال نہ کرنا چاہیے۔ کہ اس شہر کا صرف مستقبل ہی مستقبل ہے۔ اس کی موجودہ حیثیت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت بھی یہ ایک اچھا خاصا، خوبصورت اور قابل دید شہر ہے۔ جس کی آبادی تقریباً پون لاکھ ہوگی لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا۔ اس کا پھیلاؤ اور آبادی بڑھتی چلی جائے گی۔ تاہم حجم اور آبادی کا یہ پھیلاؤ نہایت منضبط اور متوازن انداز میں ہوگا۔ شہر پھیلے گا سہی لیکن بے ہنگم انداز سے نہیں جیسا کہ عام طور پر شہر پھیل جایا کرتے ہیں۔ اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے کہ آبادی ایک مناسب حد سے بڑھنے نہ پائے اور نہ ہی تجارت اور صنعت کی وہ دھکم پیل ہو جو پاکستان کے دوسرے شہروں بالخصوص کراچی میں ہوتی۔ آبادی، صنعت اور تجارت کے بے تحاشہ بڑھ جانے سے شہروں کا مزاج اور ماحول تاجرانہ ہو جاتا ہے اور ایسا مزاج اور ماحول کسی ملک کے دارالحکومت کے لئے سازگار نہیں ہوتا۔

اسلام آباد کی مٹی نرم ہے جس میں چھوٹے چھوٹے کنکر تو بے شمار ملتے ہیں۔ لیکن بڑی اور سخت پٹنائیں بہت کم ہیں۔ نرم مٹی کی وجہ سے قریبی پہاڑیوں سے اترنے والے تندر و نالوں کا عمل عریاں کاری بہت نمایاں ہے چنانچہ تمام علاقہ اونچے اونچے ٹیلوں پر مشتمل ہے جس کی سطح سمندر سے بلندی سولہ سو فٹ سے تقریباً دو ہزار فٹ تک ہے۔ شمال میں پہاڑی علاقے جو اسلام آباد کی حدود میں شامل ہیں۔ پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک ہیں۔ کسی زمانہ میں یہاں کی زمین ہموار ہوتی ہوگی اور پہاڑیوں سے آنے والے نالے برسات کے موسم میں کافی پھیل جاتے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ مٹی کے اندر گول گول دریائی کنکر بڑی تعداد میں ملتے ہیں۔ اونچے نیچے ٹیلوں کی وجہ سے سطح زمین کا منظر بہت خوبصورت ہو گیا ہے۔ اگر ہم شکر پڑیاں کے ٹیلوں پر جائیں جو ارد گرد کے ٹیلوں سے قدرے اونچے ہیں۔ تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ارد گرد کا علاقہ کتنا خوش منظر اور حسین ہے۔ شکر پڑیاں کی ڈھلانوں پر تینوں طرف قدرتی قسم کے جنگلات اگلے جا رہے ہیں جس سے قدرتی حسن اور خوبی منظر میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قدرتی قسم کے جنگلات کے علاوہ مختلف مقامات پر خوبصورت باغات بھی لگائے جا رہے ہیں۔ ان باغوں میں دنیا کے مختلف ممالک سے اعلیٰ اقسام کے پھولوں کے پودے منگوا کر لگائے جا رہے ہیں۔ اپنی نرسریاں بھی قائم کی گئی ہیں جہاں لاکھوں کی تعداد میں پودے اگا کر شہر کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں کے لئے مہیا کئے جا رہے ہیں تاکہ وہ اپنے مکانوں کے باغیچوں اور چمن زاروں میں انہیں لگائیں۔ جب یہ ہلچل عام ہو جائے گی تو یہ شہر جاپانی شہروں کی طرح پھولوں کا شہر ہو جائے گا۔

درخت اور انسان کا ساتھ بہت پُرانا ہے۔ مذہبی روایات کے مطابق

جب آدم کی تخلیق ہوئی تو ہر اسمہر باغ جنت پہلے سے موجود تھا۔ جس میں میوہ دار درخت تھے، ٹھنک نہریں تھیں۔ اور نہایت خوشگوار سامنے اور بڑی مطہر سرسبزی اور شادابی تھی۔ سائنسی اندازوں کے مطابق بھی زمین پہلے محض جمادات کا ایک تودہ تھی۔ زندگی کے آثار پیدا ہونے تو سب سے پہلے نباتات، اُس کے بعد حیوانات اور آخر میں انسان مخرج وجود میں آیا۔ درخت روزِ ازل سے انسان کا رفیق ہے وہ انسان کے لئے نہایت عمدہ اور صحت بخش قسم کی غذا مہیا کرتا ہے اُسے دھوپ سے بچاتا ہے۔ مصنوعی حرارت کے لئے ایندھن اور گھر بنانے کے لئے عمارتی لکڑی فراہم کرتا ہے۔ طبعی طور پر درخت نہایت بے ربطی اور بے ترتیبی سے اگتے ہیں لیکن جب انسان درخت اگاتا ہے۔ تو بڑے ربط، ترتیب اور حسن تنظیم سے کام لیتا ہے۔ ہرے بھرے، خوش ترتیب باغ اور اچھی طرح محفوظ رکھے ہوئے جنگل اعلیٰ انسانی تمدن اور تہذیب کا پتہ دیتے ہیں۔ اور جس ملک یا علاقہ میں باغات نہ ہوں اور عام درختوں کی کمی ہو اُس کے متعلق یہ قیاس غلط نہیں ہوتا کہ وہ ملک یا علاقہ غیر تمدن ہوگا۔ اسلام آباد کا علاقہ جدید منصوبہ بندی سے پہلے درختوں کی کمی کا علاقہ تھا۔ کہیں کہیں کچھ درخت ملتے بھی تھے تو کیکر یا پھلہا ہی کے جن کا سایہ بھی ایسا نہیں ہوتا کہ مسافر اُن کے نیچے گھڑی دو گھڑی آرام کے لئے بیٹھ سکے۔ ہاں لمبے لمبے تیز کانٹے جو ادبی زبان میں خارِ مغیلاں کہلاتے ہیں۔ رہروں کی تواضع کے لئے ضرور موجود ہوتے تھے۔ کہیں کہیں برگد کے بوڑھے پتھر بھی تھے لیکن نہایت کم۔ ارد گرد کی پہاڑیوں پر شنا تمھ، گر نڈا اور زیتون کے گھنے جنگل پائے جاتے تھے جو اب بھی موجود ہیں لیکن ان جنگلوں سے زیادہ سے زیادہ جلانے کی لکڑی دستیاب ہوتی تھی۔ زیتون کا درخت بڑا قیمتی ہے اور بہت سے یورپی اور مغربی ایشیائی ممالک اس درخت سے روغن حاصل کر کے لاکھوں روپے کی تجارت کرتے ہیں۔ لیکن یہاں اس درخت

پر عام طور پر پھل آتا ہی نہیں اور اگر کچھ درختوں پر آتا بھی ہے تو وہ روغن لگانے کے کام کا نہیں ہوتا۔ اس درخت سے بھی لوگ زیادہ سے زیادہ یہی فائدہ اٹھاتے تھے کہ اس کے پتے مولشیوں کے چارے کے طور پر استعمال کرتے اور خشک شاخیں چولہوں میں جلاتے تھے۔

درختوں کی کمی اور اُن سے صحیح فوائد حاصل کرنے کی نا اہلیت اس علاقے کے لوگوں کے کم متہدن ہونے کے واضح شواہد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے سے مسلمانوں پر محمدی زوال آیا۔ وہ حکمتِ اشیاء کے علم سے بے بہرہ ہو گئے تھے اور قدرتی وسائل موجود ہونے کے باوجود وہ اُن سے استفادہ کرنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔

اس علاقے کی آب و ہوا بحیرہ روم کے قدرتی خطے کی آب و ہوا جیسی ہے۔ یعنی موسم گرما شدید گرم ہوتا ہے اور زیادہ تر بارش موسم سرما میں ہوتی ہے۔ موسم گرما میں مون سون ہوائیں یہاں تک پہنچ جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے جولائی اور اگست کے مہینے میں بھی مچھوڑی سی بارش ہو جاتی ہے۔ لیکن گرمائی بارش اوسطاً چودہ پندرہ انچ ہوتی ہے جبکہ سارے سال کی بارش کی اوسط ۴۵۔ انچ کے قریب ہے۔ یہ علاقہ چونکہ ۳۳ درجے شمالی عرض بلد پر واقع ہے۔ اس لئے جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے یہ تجارتی ہواؤں کے علاقے میں آتا ہے۔ اگر اتفاق سے جنوب مغرب سے اُٹنے والی مون سون ہوائیں یہاں تک نہ پہنچ سکتیں تو موسم گرما مکمل طور پر خشک رہتا اور بارش صرف موسم سرما میں ہوتی۔

بحیرہ روم کے خطے جیسی آب و ہوا ہونے کی وجہ سے یہاں ایسے درخت پائے جاتے ہیں جن کی پھال اور پتے موٹے اور جڑیں لمبی ہوتی ہیں۔ خود زیتون کا درخت جو یہاں کے جنگلوں کی طبعی پیداوار ہے۔ بحیرہ روم کے خطے کا مشہور

و معروف درخت ہے۔ اس کے علاوہ شیشہوت اور انگور بھی یہاں بکثرت پیدا ہو سکتا ہے اور لیموں اور اُس کی مختلف اقسام کے درختوں کے لئے تو اس علاقے کی آب و ہوا انتہائی سازگار ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے یہاں لیموں، مالٹا، رنگترہ اور اس خاندان کے دوسرے درخت بالکل نابود تھے۔ کہیں کہیں کھٹے کے درخت ضرور ملتے تھے جن کا پھل محض بے کار ہوتا تھا۔ چھتر، سید پور، اور واہ میں لوکاٹ کے کچھ باغ تھے جن کا پھل اپریل کے مہینے میں راولپنڈی کی منڈلیوں میں آتا تھا۔ لوگ ثمر دار درخت بہت کم لگاتے تھے اور جو درخت لگتے تھے وہ بھی اعلیٰ قسم کے میوؤں کے نہیں ہوتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد لوگوں میں ثمر دار درخت لگانے کا شوق پیدا ہوا۔ اور ہر قسم کے ثمر دار درخت یہاں لگائے جانے لگے۔ قیام پاکستان سے پہلے کیلا، رنگترہ، آم اور مالٹا اُن علاقوں میں پیدا ہونے والے پھل تھے۔ جو اب تجارت میں شامل ہیں۔ لیکن جلد ہی پاکستانیوں نے ثمر دار درختوں کی کاشت میں اتنی ترقی کی کہ اب یہ پھل جتنے عمدہ اور وافر مقدار میں پاکستان میں پیدا ہوتے ہیں۔ اتنے عمدہ اور وافر مقدار میں تجارت میں پیدا نہیں ہوتے۔ اسلام آباد کے علاقے میں بھی بہت لوگوں نے کتو، مالٹے اور لیموں کے بے شمار باغات لگائے ہیں اور یہ میوے یہاں بھی بکثرت پیدا ہونے لگے ہیں۔

دارالحکومت کے ترقیاتی ادارے نے دارالحکومت کے چاروں طرف سبز علاقہ رکھنے کے انتظامات بھی کئے ہیں۔ اس سبز علاقے میں صرف ثمر دار درختوں اور پھولوں کے باغات لگائے جاسکیں گے۔ اور مکانات وغیرہ تعمیر کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ سبز لوہوں، مرغیوں اور مویشیوں کے فارم بنانے کے لئے بھی بڑے بڑے قطعات مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ جو ایسے لوگوں کو دیئے جا رہے

ہیں۔ جو وہاں سبزیوں کی آگائیں گے اور مرغیاں اور مویشی پالیں گے۔ اس سے نہ صرف سبزی، دودھ اور گوشت کی رسد میں اضافہ ہوگا بلکہ شہر میں سرسبزی اور شادابی بڑھے گی۔ اور سرسبزی اور شادابی کے بڑھنے سے موسموں پر بھی خوشگوار اثر ہوگا اور گرمی اور سردی کی وہ شدت نہ رہے گی جو فی الوقت ہے۔

درختوں میں بیش بہا اضافے کے باوجود ابھی ان کی کاشت اور ان سے تعلق رکھنے والی صنعتوں کے فروغ کے لئے اس علاقے میں بہت زیادہ امکانات موجود ہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ شہرتوت کے درختوں اور انگور کی بیلوں کی کاشت کے لئے اس علاقے کی آب و ہوا خاص طور پر موزوں ہے۔ شہرتوت کا درخت ریشم کے کیڑے پالنے کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ اسلام آباد کے علاقے کے لوگ شہرتوت کے درخت لگانے اور ان پر ریشم کے کیڑوں کے پالنے کا کام کہیں کہیں کرتے ہیں لیکن ابھی تک ان کی کوششیں انفرادی اور غیر منظم ہیں۔ اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ریشم کے کیڑے پالنے کا کام اجتماعی طور پر کیا جائے۔ اور اس صنعت کو جو بے حد نفع بخش ہے۔ جدید ترین خطوط پر منظم کیا جائے۔ اس سے ہم راولپنڈی اور دوسرے قریبی شہروں میں قدرتی ریشم کے کارخانے قائم کر سکتے ہیں۔ اور ملک کی خوشحالی کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

شہرتوت کے علاوہ انگور اور زیتون کی کاشت بھی جدید سائنٹیفک طریقوں سے کی جائے تو ملکی معیشت کو بہت زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ انگور تو ہمارے ملک میں کھانے یا زیادہ سے زیادہ کشمش بنانے کے کام آ سکتا ہے۔ لیکن اعلیٰ قسم کے زیتون کی پیداوار سے زیتون کے تیل کی صنعت قائم ہو سکتی ہے۔ جس سے ہمیں ایک طرف تو بین الاقوامی تجارتی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف عوام کو بہترین قسم کا کھانے کا تیل میسر آ سکتا ہے۔ ہر ٹپھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ کھانے کے تیلوں میں عمدہ

ترین تیل زیتون کا ہے۔ اس میں جتنی غذائیت ہے وہ گھی اور مکھن میں بھی نہیں۔ جو قومیں گھی، مکھن یا دوسرے خوردنی روغنوں کی بجائے زیتون کاتیل استعمال کرتی ہیں۔ ان کی قومی صحت کی سطح بہت اونچی ہوتی ہے۔ اسلام آباد کے چاروں طرف پہاڑیاں قدرتی زیتون کے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اگر زیتون کے ان درختوں پر اعلیٰ قسم کے زیتون کی قلمیں لگائی جائیں اور اس طرح اس درخت کی بہتر نسل یہاں پر پیدا ہو سکے تو اس سے یقیناً قومی دولت، صحت اور صنعت میں گراں قدر اضافے ہوں گے۔

ان درختوں کے علاوہ اس علاقے میں ایک اور جھاڑی پائی جاتی ہے جسے اڑسہ یا بانسہ کہتے ہیں۔ اس جھاڑی کا سینسکرتی نام وسا کا ہے۔ انگریزی اور جرمنی زبان میں وسا کا بنا لیا گیا ہے۔ اس جھاڑی کے پتوں، جڑوں اور پھولوں میں بیش بہا طبی خواص موجود ہیں۔ اور ان سے کشید کیا ہوا عرق سینے اور پھیپھڑوں کی بہت سی تکالیف میں اکیر کا کام رکھتا ہے۔ چنانچہ بعض یورپی ممالک میں اس کا عرق تیار کر کے بآمد کیا جاتا ہے۔ جو دوسرے ممالک میں جا کر بڑے مہنگے داموں بکاتا ہے۔ اس خام مواد سے ہم بھی عمدہ قسم کے طبی مرکبات حاصل کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہمارے طبی ادارے اس کی طرف توجہ دیں۔ اڑسہ یا بانسہ کے متعلق میں نے محض مثالا لکھا ہے۔ ورنہ امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام آباد اور اس کے ارد گرد کا علاقہ اس قسم کی نباتاتی دولت سے مالا مال ہے جس پر پھان بین کر کے ہم بہت عمدہ دوائیں تیار کر سکتے ہیں۔ شمال میں کوہستان مری میں بے شمار ایسی جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں جن کی پیدوار اور رسد کو تجارتی خطوط پر منظم کر کے ملک کی دولت میں معتدبہ اضافہ اور بیرونی زرببادلہ کے خراج میں قابل لحاظ کمی ہو سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے حکومت نے طب یونانی کو جیسے ہم بجا طور پر طب اسلامی کہہ سکتے ہیں۔ سرکاری طور پر تسلیم کر کے ملک میں اس طب اور اس کے

اصولوں کے مطابق طریق علاج کے فروغ کے لئے ایک یونانی و آریو ویدک طبی بورڈ راولپنڈی ہی میں قائم کر دیا ہے۔ اس بورڈ کے فاضل ارکان جو دیسی طریقہ علاج کے ماہرین ہیں سے ہیں یقیناً پہلے ساری بڑی بوٹیوں کی چھان بین کرنے اور انہیں کام میں لانے کے جدید طریقوں پر ریسرچ کر کے اپنے وطن اور اہل وطن کی قابل قدر خدمات سرانجام دے سکتے ہیں۔

اسلام آباد کی تعمیر سے برصغیر ہند و پاکستان کے اس انتہائی شمالی حصے کو ایک بار پھر دیسی ہی بلکہ اُس سے بے تحاشہ زیادہ عظمت اور اہمیت حاصل ہو گئی ہے جو اسے آج سے اڑھائی ہزار برس پہلے حاصل تھی۔ اُس زمانے میں ٹیکسلا اس برصغیر کا متمدن ترین شہر اور سب سے بڑا علمی مرکز تھا۔ جہاں تمام ایشیائی ممالک سے طلباء تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔ افغانستان اور ایران تو بالکل پڑوس میں تھے چین کے دور افتادہ شہروں تک کے لوگ اس شہر کو اپنی عقیدتوں کا مرکز مانتے تھے اور مہینوں بلکہ سالوں دشوار گزار راستوں سے سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچتے تھے اور اس علاقے میں واقع مقدس مقامات کی زیارت کر کے روحانی فلاح و بہبود کی منازل طے کرتے تھے۔ مستقبل قریب میں اسلام آباد بھی ویسی ہی مرکزیت اور اہمیت حاصل کر لے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی یہ مرکزیت اور اہمیت چین اور وسط ایشیا کے ممالک کے لئے محض سیاسی ہوگی تاہم مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے اسلامی ممالک کے لئے اس کی مرکزیت میں مذہبی تصورات اور رجحانات کو بھی بڑا دخل ہوگا۔ اور اس بات کے نہایت قوی امکانات موجود ہیں کہ مستقبل قریب میں اسلام آباد کو دنیا کے اسلام کے اعصابی مرکز کی حیثیت حاصل ہو جائے اور یہ شہر اسلامی دنیا میں وہی مرتبہ اور مقام حاصل کر لے جو کسی زمانہ میں بغداد یا غرناہ یا دہلی کو حاصل تھا۔

اگر اسلام آباد کی ساخت، پس منظر، بھرا فیا فی محل وقوع، آب و ہوا اور
انداز تعمیر کا بہ نظر غائر مشاہدہ کیا جائے تو ہمارا ذہن فوراً اسلامی دنیا کے ایک اور شہر
کی طرف جاتے ہے جو اسلام آباد کی طرح حال ہی میں معرض وجود میں آیا ہے۔ یہ شہر انقرہ
ہے جس کا سابقہ نام انگور تھا اور وہ ترکیہ کے مرکزی علاقہ کا ایک معمولی سا شہر بلکہ قصبہ
تھا۔ جدید انقرہ پرانے انگورہ کی جائے وقوع پر ہی آسمان سے لیکن آج کے انقرہ کو
دیکھ کر پرانے انگورہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام آباد کی طرح انقرہ بھی ایک پٹیل
سطح مرتفع پر واقع ایک ایسا مقام تھا جہاں دور دور تک درخت کا نام و نشان
بھی نہ تھا۔ چونکہ موہری بکریوں کے بالوں سے قالین بانی کا کام ایک مقبول عام اور نفع بخش
دستکاری تھی اس لئے وہاں بکریوں کے بڑے بڑے گتے پالے جاتے تھے۔ ان بکریوں
نے ہی درختوں کو مٹھکانے لگا دیا تھا۔ درخت ختم ہوئے تو بارشیں کے پانی نے مٹی کو
گھر گھر کھینچ کر بہاؤ شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ صرف پتھر پٹی چٹانیں باقی رہ گئیں۔ اتار کر
کے حکم سے لاکھوں من مٹی باہر سے لاکر ان پتھر پٹی چٹانوں پر جمائی گئی اور اس مٹی
میں درخت لگائے گئے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد پٹیل سطح مرتفع پر ہزاروں سرسبز
درخت دکھائی دینے لگے اور خشک بھرا انگورہ کی جگہ ایک ہرا بھرا انقرہ سطح زمین پر ابھر
آیا۔ اسلام آباد کے علاقہ میں بھی بکریوں اور بھیڑوں کے بڑے بڑے ریوڑ پالے جاتے
تھے۔ موسم سرما میں جب ضلع ہزارہ کے بالائی علاقوں میں برف کی موٹی تہہ جھنے لگتی تھی
تو ان علاقوں کے بھیڑ بکریاں پالنے والے لوگ اپنے ریوڑوں سمیت اس علاقے پر نازل
ہو جایا کرتے اور زمین چار مہینے ان کی بکریاں ہرے بھرے درختوں کو مٹھتی دل کی
طرح چاٹ جاتیں۔ چنانچہ ایسی قسموں کے درخت جو بکریوں کے لئے لذیذ تھے پاس
علاقہ میں روز بروز کم ہوتے جا رہے تھے۔ یہ تو بھلا ہوا انگریز کا کہ وہ جنگلات کی حفاظت
کے لئے ایسے قوانین مرتب کر گیا تھا۔ جنہیں توڑنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اور

ہاتھ کی بدولت بے تحاشا شاخ تراشی کے باوجود کچھ درخت باقی رہ گئے۔ قدرت نے اس علاقہ میں بعض ایسے درخت یا جھاڑیاں بھی پیدا کی ہیں۔ جن کے پتوں کی تلخی اور کسلا پن بکری کے کام و دہن کے بھی موافق نہیں۔

آب و ہوا کے اعتبار سے بھی انقرہ اور اسلام آباد میں گہری مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے۔ انقرہ ۴۰ درجہ عرض بلد پر واقع ہے اور اسلام آباد ۳۴ درجہ عرض بلد پر۔ اس طرح دونوں ہواؤں کے اس قدر قریبی نقطہ میں واقعہ ہیں جہاں موسم گرمائی خشک تجارتی ہوائیں چلتی ہیں اور موسم سرما میں مرطوب مغربی ہوائیں۔ اس لئے دونوں مقامات پر بارش سردیوں کے موسم میں ہوتی ہے۔ البتہ اسلام آباد چونکہ مون سون ہواؤں کے خطے کے بالکل قریب واقع ہے اور بحیرہ عرب سے اُٹھنے والی مرطوب ہوائیں یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ اس لئے یہاں موسم گرمائی بھی تھوڑی سی بارش ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام آباد پہاڑ کے دامن میں ہے اور اس کے شمال میں کوہ ہمالیہ کے مغربی سلسلے کے بلند پہاڑ ہیں۔ لہذا سردیوں کے موسم میں شمال سے آنے والی برف بستہ ہواؤں سے محفوظ ہے جس سے یہاں سردی شدید نہیں ہوتی جبکہ انقرہ میں سردیوں کے موسم میں چلنے والی سخت سرد ہوائیں بے روک ٹوک آتی ہیں جس سے وہاں کا سردیوں کا موسم بہت شدید ہوتا ہے۔

اسلام آباد کے علاقہ کی نباتات کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ یہ تمام نباتات انقرہ کے علاقہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس طرح نباتاتی پیداوار کے لحاظ سے بھی یہ دونوں عظیم شہر باہم مشابہت اور ہم نظیر ہیں۔

اس قدر قریبی مشابہت اور مماثلت کے علاوہ دونوں شہروں کی تعمیر میں سیاسی عوامل کی ہم آہنگی بھی لائق توجہ ہے۔ انقرہ کی تعمیر جدید پہلی جنگ عالمگیر کے خاتمے کے بعد ہوئی۔ جب ترکی سیاسی کمزوری کے آخری درجہ کو پہنچا ہوا تھا اور مغربی سلطنتی

ملکوتیں اُسے بالکل ختم کر دینے پر تکی ہوئی تھیں۔ اسلام آباد کی تعمیر دوسری جنگ عالمگیر کے کچھ عرصہ بعد شروع ہوئی۔ جب پاکستان کو عالم وجود میں آنے ہوئے بارہ برس ہی گزرے تھے اور یہ مملکت خداوندیوں کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ اور پاکستان کے قریبی دشمن اپنے دور افتادہ لیکن قومی دست دوستوں کی حمایت کی شہ پر اسے تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دونوں شہروں کی بنیاد ایسے سپاہی سیاست دانوں کے ہاتھوں پڑی جو مضبوط کردار کے مالک اور سیاسی بصیرت میں نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ دونوں شہروں کی تعمیر نہایت قلیل عرصے میں ہوئی۔ اسلام آباد کی تعمیر کے آغاز کو چند ہی سال ہوئے ہیں لیکن اس وقت یہ ایک خاصا بڑا شہر بن چکا ہے اور شام کے وقت گلیوں اور بازار کی چہل پہل دیکھ کر قطعاً یہ خیال نہیں ہوتا کہ آج سے چند سال پیشتر یہ سارا علاقہ بنجر اور بگڑ گیاہ تھا اور کہیں کہیں جو چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد تھے ان کی حیثیت صحرائیں نخلستانوں کی سی تھی۔ اس شہر کا مرکزی حصہ پورے طور پر آباد ہو چکا ہے۔ اور اب یہ متواتر شمال اور جنوب کی طرف پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ ابتدائی منصوبے کے مطابق اس کی تعمیر پندرہ برس میں مکمل ہونی چاہیے لیکن جس تیزی اور جوش و خروش سے حکومت اور حکومت کے ساتھ ساتھ عوام اسے بنانے اور بڑھانے میں مصروف ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ توقع بیجا نہیں کہ یہ شہر مجوزہ میعاد سے پہلے ہی تکمیل پذیر ہو جائے گا۔

مجھے بہت سے ایسے لوگوں سے تبادلہ خیالات کرنے کا موقع ملا ہے جو دنیا کے اکثر ممالک کی سیاحت کر چکے ہیں اور ان ممالک کے دار الحکومتوں کو تفصیل سے دیکھ چکے ہیں۔ یہ سب لوگ اس رائے پر متفق ہیں کہ دنیا کے کسی ملک کا دار الحکومت ایسا خوبصورت اور خوش منظر نہیں جیسا اسلام آباد ہے۔ جہاں تک پاکستانیوں کی رائے کا معاملہ ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے اس رائے

میں جند باتیت کا دخل ہے۔ لیکن یہ رائے صرف اہل پاکستان کی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کے جو سیاح اسلام آباد کو دیکھتے آتے ہیں۔ اُن میں سے بھی اکثر و بیشتر کی رائے یہی ہے۔ اسلام آباد کی خوبصورتی بڑی حد تک اس کے قدرتی محل وقوع اور پس منظر کی مرہونِ منت ہے۔

انسانی دولت

یہاں تک ہم نے اُن مادی دولتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے بعض قدرت نے بڑی فراوانی سے اس علاقہ کو عطا کی ہیں اور بہت سی ایسی چیزوں کا ذکر نہیں کیا جن میں قدرت نے یا تو فیاضی سے کام نہیں لیا یا اُن کی بہت زیادہ کمی ہے۔ لیکن قدرت نے اس علاقہ کو جو دولت نہایت فراوانی سے بخشی ہے وہ انسانی دولت ہے۔ اور یہ دولت اس علاقہ کو ہمیشہ سے متاثر ہی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بہت پہلے جب دریائے سندھ کا مغربی علاقہ وسیع ایرانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ پوٹھوہار کے جیالے لوگ اپنے شہنشاہ کی فوجوں میں شامل ہو کر ایران، ایشیائے کوچک بلکہ یونان اور مشرقی یورپ کے ملکوں میں جا کر دایہ شجاعت دیتے تھے۔ پوٹھوہار کے علاقہ کی فوج کے تذکرے قدیم ایرانی تاریخوں میں موجود ہیں۔

جب سکندر یونانی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اُسے سب سے پہلے پوٹھوہار کے شمالی علاقہ میں ہزارہ کے پہاڑی قبائل سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اور اگرچہ ٹیکسلا کے راجہ امبھی نے سکندر کی اطاعت قبول کر لی لیکن عوام نے اپنے راجہ کی اس اطاعت گزاری کو ہرگز قبول نہ کیا اور جونہی سکندر کی واپسی ہوئی۔ اس علاقہ کے لوگوں نے چذر گپت موریا کی قیادت میں بغاوت کر دی اور جلد

ہی اپنی آزاد حکومت قائم کر لی جو آگے چل کر ایک عظیم الشان سلطنت کی صورت اختیار کر گئی۔

ہم گذشتہ البواب میں تفصیل کے ساتھ اس چیز کا اظہار کر آئے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ برصغیر ہندوستان کے شمالی حصہ میں سب سے پہلے پوٹھوہار ہی میں ہوئی۔ اسلام نے ان لوگوں کو جو قوت عطا کی اس کی بنا پر یہ لوگ بہت زیادہ بہادر اور جنگجو ہو گئے اور شمال کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کے خلاف — ہر چند کہ یہ حملہ آور عام طور پر مسلمان ہوتے تھے۔ سینہ سپر ہوتے رہے۔ ان لوگوں نے مشرق اور جنوب کی طرف پیش قدمی بھی کی اور راجپوتوں کی اجتماعی طاقت کو پاش پاش کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

موجودہ دور میں تحریک پاکستان کے دوران یہاں کے لوگوں نے مسلم لیگ کے لئے بڑی بے لوث اور موثر خدمات سرانجام دیں اور ۱۹۴۷ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے تمام امیدواروں کو بیڑی مہجاری اکثریت کے ساتھ کامیاب کیا۔ انگریز کا خیال تھا کہ اس علاقہ کے لوگ چونکہ زیادہ تر فوج میں ملازم ہیں اور عموماً پورے حکومت کے وفادار ہوا کرتے ہیں اس لئے وہ یونیٹ پارٹی کا جسے انگریز حکومت کی پوری پوری تائید اور حمایت حاصل تھی کامیاب کر آئیں گے لیکن اس علاقہ کے لوگوں نے سیاسی بیداری اور اعلیٰ شعور کا ثبوت دیا اور تحریک پاکستان میں دوسرے کسی علاقہ کے لوگوں سے پیچھے نہ رہے۔

اسلام آباد کا علاقہ شدت کی آب و ہوا کا ہے۔ یہاں موسم گرما میں درجہ حرارت ۱۱۷ درجہ تک بھی پہنچ جاتا ہے اور موسم سرما میں کم از کم درجہ حرارت صفر درجہ سے بھی نیچے چلا جاتا ہے۔ تاہم گرمی اور سردی کی شدت صرف ایک دو مہینے رہتی ہے باقی سارا سال موسم خوشگوار اور معتدل ہوتا ہے۔ یہ خوشگوار اور معتدل آب و ہوا

پٹری صحت بخش ہوتی ہے۔ چنانچہ اس علاقہ میں بسنے والے لوگ غربت اور افلاس کے باوجود عام طور پر صحت مند اور چاق پو بند رہتے ہیں۔ کراچی سے آنے والے لوگ اگرچہ کچھ عرصہ تک موسم سرما کی شکایت کرتے رہے، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے محسوس کر لیا ہے کہ یہی موسم انسان کے اندر تندرستی، توانائی اور کام کرنے کی قوت پیدا کرتا ہے۔

اسلام آباد کی تعمیر کے بعد راولپنڈی کی اہمیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے اور اب تک بہت سے سرکاری محکمے اسلام آباد کی بجائے راولپنڈی میں کام کر رہے ہیں۔ دارالحکومت کی آبادی چونکہ ایک خاص حد تک بڑھنے دی جائے گی۔ اس لئے اضافہ آبادی کا بوجھ جو دارالحکومت کی آمد کا لازمی نتیجہ ہے۔ زیادہ تر راولپنڈی ہی کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ شہر کے چاروں طرف مضافاتی بستیوں میں تعمیرات کا سلسلہ شب و روز جاری ہے۔ لیکن مکانات کی دستیابی پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہو گئی ہے تو فتح ہے کہ آئندہ کئی سال تک اسلام آباد اور راولپنڈی کی انسانی دولت میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا رہے گا۔ اور چونکہ تمام دولت کی پیداوار انسانی محنت کی مرہون منت ہے۔ اس لئے اسلام آباد اور اس کے ساتھ ہی راولپنڈی بھی رفتہ رفتہ ثروت مند شہر بن جائے گا۔

علمی مستقبل

جدید ترین تعلیمی اصلاحات کی روشنی میں آئندہ اردو زبان کو مغربی پاکستان میں وہی مرتبہ اور مقام حاصل ہو گا جو آج کل انگریزی زبان کو حاصل ہے۔ اس لئے اب اس شہر میں اردو زبان کی تشوینا اور فروغ کے بے حد امکانات ہیں۔ اسلام آباد میں قومی یونیورسٹی قائم کر دی گئی ہے۔ اور اگرچہ ابھی تک اس

یونیورسٹی میں محض پوسٹ گریجویٹ ریسرچ کا کام ہو رہا ہے اور وہ بھی صرف دو تین سائنسی مضامین میں اس لئے ابھی تک اردو زبان کی مٹوس اور مثبت ترقی کے لئے کوئی نمایاں کام نہیں ہو سکا لیکن یہ توقع بے وجہ نہیں کہ حالات چلے پہلے کچھ ہو جائیں اور دفتر شاہی انگریزی زبان کو قائم رکھنے کی کیسی ہی کوششیں کرے چند سال کے اندر اندر اردو لازمی طور پر تمام مدارس میں ذریعہ تعلیم بن جائے گی۔ اور یہ تو سچ بھی ہے جانے ہوگی کہ اس یونیورسٹی سے جو لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلیں گے وہ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اردو زبان پر عبور رکھنے والے ہوں گے۔

دار الحکومت کی منتقلی کے پہلے دور میں ہی بعض کثیر الاشاعت اخبارات کے دفاتر بھی راولپنڈی میں منتقل ہو گئے ہیں۔ انگریزی زبان کا اخبار پاکستان ٹائمز اور اردو اخبار جنگ تقریباً ایک سال سے راولپنڈی سے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ کئی دوسرے اخبارات بھی اس فکر میں ہیں کہ کسی نہ کسی طرح راولپنڈی آ پہنچیں۔ (نوائے وقت) لاہور ایک عرصہ سے راولپنڈی سے بھی شائع ہوتا ہے۔ لاہور کا روزنامہ "وفاق" بھی اسی طرح راولپنڈی سے شائع ہو رہا ہے۔ اسلام آباد سے حال ہی میں انگریزی اخبار "مسلم" (MUSLIM) جاری ہوا ہے جو پاکستان ٹائمز کا حریف بن چکا ہے)

موجودہ حالات اس چیز کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ آنے والے چند سال کے اندر اندر راولپنڈی ملک کا سب سے بڑا صحافتی مرکز بن جائے گا اور اشاعتی ادارے بھی یہیں قائم ہوں گے۔ اشاعتی اداروں کے قیام سے اس علاقے کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی آگے آنے کے مواقع میسر ہوں گے۔ اور ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ مستقبل قریب میں اس خاک سے بڑے درخشندہ ستارے اُبھر رہے ہیں جن کی چمک دمک سے دنیائے ادب کا افق رنگارنگ روشنیوں سے جگمگا اٹھے گا۔

مصنف کی دیگر گراں قدر تصانیف



موسیقار	ابتدائی کلام	ٹایپ
حیدر کا بیٹا	قدرے طویل قوی نظم	ٹایپ
داستانِ مری	تیسرا ایڈیشن	
پوشو ہاری لوک گیت	پانچواں ایڈیشن	
حکمتِ بیدار	تیسرا ایڈیشن	
دوش و فردا	مجموعہ غزل	تیسرا ایڈیشن
آزادیِ موہوم	ترجمہ کتاب ذوالفقار علی بھٹو	
ہدیہ دوستوں	فارسی نظم و نثر	ٹایپ
نغم	نعت و منقبت	
طہر کا پاسبان	سوانح (قائد اعظم محمد علی جناح)	
مہر علی شاہ	حضرت مہر علی شاہ صاحب کے کلام کا منظوم ترجمہ	
قائد اعظم محمد علی جناح	شخصیت و کردار	

مکتبہ المحمود 326 سکیم تھری چکالہ، راولپنڈی

ظہیر الدین ظہیر سیفی